شادی، جنس اور جذبات
سلیم اختر
۵۴
روشن کتابیں
شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز، ۱۹۹ سرکلر روڈ، چوک انارکلی، لاہور نمبر ۲/ ۵۴۰۰۰

دنیا کی ہر قومی اور علاقائی زبان
کی روشن کتابوں کا انتخاب

نگران : شیخ نیاز احمد
مدیر مسئول: اسد نیاز
مدیر : محمد طاہر معراج

مجلس مشاورت :
اے حمید۔ ایم ایس نازؔ
محمد حنیف شاہد۔ عینکاف خالدؔ

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : غلام علی پرنٹرز، اشرفیہ پارک
فیروز پور روڈ، لاہور

مقام اشاعت

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ پبلشرز
۱۹۹۔ سرکلر روڈ، چوک انارکلی، لاہور ۵۴۰۰۰ (پاکستان)
پی او بکس نمبر528

PHONE NO : 7352908- 7323951
FAX : 92- 42- 7583611
TELEX : 44422 ASIA PK

کتاب مین (KITABMAN) لاہور
ISBN- 969- 31- 0294- 6
CODE NO : 52- 11- 15

شادی، جنس اور جذبات

"مرد جنس کے آئینے میں" اور "عورت جنس کے آئینے میں" آپ پڑھ چکے۔۔۔ اور اب اسی سلسلے کی تیسری اور فخریہ پیش کش۔۔۔۔ "شادی، جنس اور جذبات" آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ازدواجی زندگی کے الفاظ اگرچہ خوش گوار دھڑکنوں کو جنم دیتے ہیں لیکن دیکھا جائے تو اس میں کچھ ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب عقل و تدبیر کا دامن ہاتھوں سے چھوٹ چھوٹ جاتا ہے اور ازدواجی زندگی ان گنت الجھنوں اور بے شمار مسائل کی ایک خوفناک تصویر نظر آنے لگی ہے یہاں تک کہ کم ہمت لوگ زندگی سے کنارہ کشی تک کی بات سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، الجھی ڈور کے اس بہت بڑے گولے کو لاکھ سلجھانے کی سعی کرتے ہیں، لیکن ہر تدبیر ان کا منہ چڑاتی ہے اور ناکامی آڑے آتی ہے۔ تلخیوں کا زہر رگ و پے میں دوڑتا محسوس ہوتا ہے۔

جناب **سلیم اختر** اپنی اس کتاب میں معاشرے کی اس سب سے بڑی الجھن کا حل بتاتے ہیں۔ وہ آپ کو بتاتے ہیں کہ 'کامیاب ازدواجی زندگی کیسے گزاری جا سکتی ہے' تلخیوں' خامیوں' ناکامیوں کے زہر سے آپ کو بچالے جانے کی' ان کی یہ کوشش لائق تحسین ہے۔

زیر نظر کتاب میں جی۔ وی ہملٹن' کیتھ میک گوون' رابرٹ لاٹوڈ کنسن' جوفرے گوریہ' مارگریٹ میڈ اور لارا ہٹن کے مضامین شامل ہیں۔ جنس کے موضوع پر ان ماہرین کی تحریریں ایک جگہ اس طرح سمو دی گئی ہیں کہ ایک خوبصورت اور موضوع کے لحاظ سے اہم ترین کتاب بن گئی ہے۔ یہی **سلیم اختر** صاحب کا کارنامہ ہے۔ امید ہے' آپ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے۔

اس کے ساتھ ہی آپ مسلم شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا کی قسط نمبر۱۴ ملاحظہ فرمائیں گے۔

نیاز احمد

جی وی ہملٹن اور
کینتھ میک گوون

"میری شادی میں کیا خامی ہے"؟

سو شوہروں کا فیصلہ

جب ایک مرد اور ایک عورت رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتے ہیں تو عموماً اس کا یہی مطلب لیا جاتا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو بے حد مسحور کن پاتے ہوئے اتصال کے اسی طریقہ کو بخوشی اپناتے ہیں جسے قانون اور سماجی اقدار ہی نہیں بلکہ ان کی اپنی خواہشات بھی ایک مخصوص نوعیت عطا کرتی ہیں۔ فریقین کے ارادے نیک ہوتے ہیں دونوں ہی اس اتصال کو دائمی ہم آہنگ اور آسودگی بخش دیکھنا چاہتے ہیں اور ایک ایسی صحت مندانہ فضا کی توقع بندھ جاتی ہے کہ اگر اس اتصال کے نتیجہ میں بچے پیدا ہوں یا کسی کو متبنیٰ بنایا جائے تو پرورش کے لیے ماحول موزوں رہے۔ مرد اور عورت کا یہ معاہدہ ایسا ہے کہ اگر وہ اسے باہمی رضامندی کے بعد ختم کرنا بھی چاہیں پھر بھی وہ کم از کم سماجی امراض کی فہرست میں ایک عدد کا اضافہ تو ضرور ہی کر دیتے ہیں ان کی شادی کا والدین بن جانے کے بعد علیحدگی یا طلاق پر منتج ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے مردم شناسی میں جو غلطی کی تھی اس کا اعتراف کر لیا بلکہ اولاد کے نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو وہ ایک غیر فطری اور تکلیف دہ صورت حالات پیدا کرنے کے موجب بنتے ہیں یہ حیاتیاتی گناہ ہے! معاشرتی قواعد یا حکومت کے قوانین کی خلاف ورزی ہی گناہ نہیں بلکہ بعض حالات میں تو یہ وصف بن جاتی ہے لیکن ذہنی اور جسمانی صحت کے مسلمہ اصولوں کو پاؤں تلے روندنا کوئی وصف نہیں۔ ہاں! ان حالات میں اسے وصف سمجھا جا سکتا ہے جب فرد سوچ سمجھ کر دوسروں کی بہبود پر خود کو قربان کر دے۔ جب کہ طلاق میں وہ اپنی خاطر دوسروں ۔ بچوں ۔ کی بہبود قربان کرتا ہے۔ ازدواج کی مانند طلاق میں بھی یہ عقلی اصول کارفرما ہونا چاہیے کہ دونوں اگر اکٹھی زندگی بسر کریں تو اس سے فریقین اور بچوں کے لیے ہم آہنگیوں اور آسودگیوں کے مقابلہ میں چپقلشوں اور پژمردگیوں کا کیا توازن رہتا ہے۔

اس لیے شادی ہی نہیں بلکہ تمام ازدواجی سلسلہ کی کامیابی میں چپقلشیں اور پژمردگیاں بے حد اہم کردار ادا کرتی ہیں اس لیے اس ازدواجی جائزہ کا پہلا سوال ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سے سوالات ایسے تھے جن سے ہم نے ان دو سو مردوں اور عورتوں کی ازدواجی پژمردگیوں اور چپقلشوں کی وجوہات دریافت کر کے ان کی فہرست مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں انہی وجوہات سے بحث کی گئی ہے۔

— ۲ —

"تمہاری شادی میں عدم اطمینان کا خصوصی باعث کیا ہے؟"

یہ پہلا سوال ہی بہت خطرناک ثابت ہوا۔ اور صرف اس ایک سوال کے جوابات اور ردعمل ہی کافی سے زیادہ مواد فراہم کر گئے۔ گو اس سوال کے علاوہ ایک درجن اور سوالات بھی تھے جو ازدواجی بے اطمینانیوں سے بحث کرتے تھے لیکن یہ پہلا سوال کچھ ایسا غیر متوقع تھا کہ اس سے گویا ذہن میں ایک بحران آ جاتا اور یوں سب سے زیادہ تکلیف دہ، گہری اور اہم ترین شکایات اور مشکلات ایک دھماکہ کی طرح ان کے شعور میں آ جاتیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ان شعوری شکایات کی اساس ان لاشعوری عوامل اور محرکات پر استوار ہو جن کی نوعیت طویل تحلیل نفسی سے ہی معلوم کی جا سکتی ہے پہلا سوال جو ذہنی بھونچال پیدا کرتا اس لیے تمام مردوں نے جو بھی جوابات دیئے وہ سوچ اور شعوری کاوشوں کے مرہون منت نہ تھے انہوں نے تلخ حقائق کو خوش رنگ اور پر تصنع لبادوں میں لپیٹ کر نہ پیش کیا۔

ان سو میں سے ۳۹ مردوں نے اپنی شادی سے خصوصی بے اطمینانی کا اظہار نہ کیا۔ جائزہ کے اختتام پر کامیاب شادی کا امتحان پاس کر لینے والے ۱۵ مردوں میں سے بھی ۱۳ خاوندوں نے ہی ازدواجی زندگی سے کسی نہ کسی خصوصی بے اطمینانی کا اظہار کیا۔

المختصر! کل ۶۱ مردوں نے اپنی ازدواجی زندگی میں بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ بہت سے خاوند کئی وجوہات کی وجہ سے ناخوش تھے ایک خاوند ایک درجن شکایات لیے بیٹھا تھا مگر ۱۵ مرد کسی ایک وجہ سے پریشان رہتے تھے۔ گو ان ۶۱ مردوں نے کل ۲۴۳ شکایات کیں لیکن بلحاظ نوعیت یہ ملتی جلتی تھیں۔

اگر ازدواجی بے اطمینانی کے بارے میں ان سو مردوں کے خیالات پر مشتمل ایک واضح تصویر بنانا چاہیں تو تمام شکایات کو عمومی اور وسیع مفہوم والے عنوانات کی ذیل میں آنا لازم ہو جاتا ہے اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہم مختلف النوع ۲۴۳ شکایات کو ۱۱ عنوانات تلے درج کر دیں۔ اس سے ہمارے سامنے شادی کے بارے میں ایک دلچسپ اور متنازعہ فیہ مسئلہ آ جاتا ہے۔ کیا روحانی کی بجائے جسمانی تعلقات زیادہ اہم ہیں؟

بلکہ "روحانی" کی جگہ "طبائع" کا لفظ زیادہ موزوں رہے گا کیونکہ اسی لفظ کی ذیل میں ہم میاں بیوی کے وہ رجحانات، تعصبات، ذوق اور عادات لا سکتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح سے باعث فساد بنتی رہتی ہیں۔ واضح رہے کہ اختلافِ طبائع کی شکایات خالص جسمانی تعلقات سے زیادہ تھیں۔ جنسی تعلقات کے بارے میں شکایت کرنے والے ۳۹ مردوں کے مقابلہ میں ۴۹ مردوں نے طبیعتوں کے اختلافات کی شکایت کی۔ ویسے انفرادی شکایات کی استعداد اور شدت جانچنے کا یہ معیار قطعی نہیں کیونکہ ہم یہ نہیں جان سکتے کہ اختلافِ طبائع میں لاشعوری جسمانی عوامل کا کتنا ہاتھ ہے۔ یہی کچھ اس کی برعکس صورت کے لیے بھی کہا جا سکتا ہے بلکہ ہم تو اتنا بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ ہر آدمی ایک طرح کی پریشانی میں مبتلا تھے جب کہ ہر کسی اور طرح کی۔ اکثر مرد ایک سے زیادہ شکایات کے باعث ازدواجی زندگی سے عاجز آ چکے تھے اس لیے جسمانی اور طبیعتوں کے اختلافات میں واضح قسم کا خط امتیاز نہیں کھینچا جا سکتا۔ آیئے ان کا جدا گانہ جائزہ لینے کی کوشش کریں!

اگر ہم صرف ایک شکایت کرنے والے مردوں سے آغاز کریں تو جسمانی تعلقات کی اہمیت اجاگر ہو جاتی ہے لیکن ان مردوں کی اقلیت ہے یہ صرف ۱۵ ہیں۔ ان ۱۵ میں سے بھی ۶ جسمانی لحاظ سے آسودہ نہ تھے جب کہ تین کے خیال میں صرف طبیعتوں کے اختلافات ہی سارے فساد کی جڑ تھے۔

اس کے برعکس دیگر شکایات سے قطع نظر۔ ایسے مردوں کی تعداد ۲۵ بنتی ہے جنہوں نے اختلافِ طبائع کی تو شکایت کی مگر شادی میں جنسی مطابقت پر کوئی نکتہ چینی نہ کی گویا کل تعداد کا ۱/۴ حصہ ایسے مردوں پر مشتمل ہے جو طبیعتوں کے اختلافات سے تو نالاں تھے مگر جسمانی لحاظ سے انہیں اپنی شادی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ صرف ۱۵ مردوں نے طبیعتوں کے اختلافات کو خارج کرتے ہوئے جسمانی ناآسودگی پر زور دیا تھا۔

یہ امر موجب دلچسپی ہے کہ رشک اور حسد کرنے والے تمام مردوں نے اختلافِ طبائع کا بھی ذکر کیا۔ جب کہ ان حاسد خاوندوں میں سے ایک تہائی اپنی جنسی زندگی سے بالکل مطمئن تھے۔ آیئے! اب شکایات کی ان گیارہ اقسام کا سرسری جائزہ لیں جن کی وجہ سے یہ سو مرد اپنی ازدواجی زندگی میں کوئی نہ کوئی خامی محسوس کرتے تھے۔

مندرجہ ذیل ترتیب بلحاظ تعداد ہے

اختلافِ طبائع	۴۹
جسمانی ناآسودگی	۳۹
نجی آزادی کا فقدان	۱۰
خرابی صحت	۱۰

حسد ۸

بچوں کے باعث جھگڑا ۸

معاشی مشکلات ۸

رشتہ داروں کے باعث جھگڑا ۷

بیوی کے باعث سماجی زندگی میں گڑبڑ ۵

ازدواجی تقاضوں کی بجاآوری میں پیشہ کی رکاوٹ ۲

مذہبی اختلافات ۱

اور ——

"کوئی چیز ٹھیک ہی نہیں !" ۲

—— ۳ ——

— یہ تو تھا شماریاتی پہلو !

اب ہم اس کا انسانی نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہیں ۔

جب یہ مرد ہمارے سامنے بیٹھے سوال کے بعد سوال کا جواب دے رہے تھے تو انہوں نے یادوں پر سے پہرہ ہٹا دیئے اور یوں ماضی کے نہاں خانہ میں دفن شدہ رنجشیں، خودآزاری، الجھن، شک وشبہ، پرصبر شیفتگی — غرضکہ وہ تمام ہیجانات منظرِ عام پر آگئے جو اس عظیم تناقض — ازدواجی رشتہ کی بےتکلفی اور انسانی انا کی خلوت گزینی — کے جسم دہندہ ہوتے ہیں ۔ ان کے منہ سے جملوں اور الفاظ کا ایک سیلاب امڈا پڑتا تھا یہ سب ان مردوں کے کم اہمیت خوفوں اور پُراہمیت المیوں کے مظہر تھے جو عورت کو سمجھ کر اس کی فطرت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی سعی میں مصروف تھے ۔

یہاں ان کے کچھ جملے درج کیے جاتے ہیں یہ ظاہر ہے کہ ان کے اصل الفاظ اور فقرات استعمال نہ کیے جاسکتے تھے لیکن ان میں فقرات کا مفہوم اور روح جذب کرلی گئی ہے یا بعض ہیجانات کو بطورِ خلاصہ بیان کیا گیا ہے ۔ ان کے مطالعے سے ان سو مردوں کی مکمل آسودگی سے لے کر ہیجانی بحران کے شکار خاوندوں تک — کی ہیجانی زندگی بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے ۔

"کچھ نہیں" !" . . . . ." میری شادی میں ایسی کوئی چیز بھی تو نہیں جو میرے لیے باعثِ آسودگی ہو" . . . . ." واضح قسم کا جواب دینا مشکل معلوم ہوتا ہے کوئی ایسی خاص بات تو نہیں ۔ بس کوئی ایسی نمایاں قسم کی جھگڑے والی بات نہیں !" . . . . ." دراصل اس کا قطعی جواب دینا بہت مشکل ہے ۔ کم ازکم گذشتہ سالوں سے تو ہم بہت خوش اور مسرور زندگی گذار رہے ہیں" . . . ."

یہ واقعی اہم سوال ہے ۔ ان دنوں تو بے اطمینانی کی ایک ہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ میں اپنی آمدنی سے خاطرخواہ مادی آسائشات بہم نہیں پہنچا سکتا ۔ اپنی بیوی کے لیے جو تنخواہ لا رہا ہوں میں اس سے واقعی مطمئن نہیں ہوں" . . . ." اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے کوئی ایسی بات تو نہیں ۔ میری پریشانی کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ اکٹھے رہنے کے لیے ہم جو قیمت ادا کر رہے ہیں ہمیں اس کے حساب سے تھوڑی خوشی مل رہی ہے" . . . ." زندگی اتنی مطمئن ہے کہ اس سوال کا جواب مشکل معلوم ہو رہا ہے ۔ شاید میں اس وجہ سے تھوڑا سا غیرمطمئن ہوں کہ ہم کسی ایسی ملازمت کے حصول میں ناکام رہے ہیں جس کے لیے ہم اپنی مشترکہ مساعی سے کام لے سکتے" . . .

"صرف پابند ہونے کا تصور" . . . . ." میں تو بندش کہوں گا" . . . . ." ایک فرد کے ساتھ بندھے رہنا ۔ شادی سے پہلے مجھے جی بھر کر زندگی گذارنے کا موقعہ نہ مل سکا تھا اس لیے اب میں دوسرے مردوں سے رشک کرتا ہوں ۔ مجھے احساس ہے کہ اب یہ کھیل کھیلنے کی عمر نہیں مجھے ایسے خیالات زیب نہیں دیتے اور یہ میری بیوی کے حق میں بھی ٹھیک نہیں کیونکہ وہ مثالی رفیق ہے ۔ وہ لامحدود خصوصیات کی حامل ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ایک سے زیادہ معاملات میں مجھ سے ارفع تر ہے" . . . . " میں تو صرف فقدانِ آزادی محسوس کرتا ہوں اور شاید اپنی بیوی کی بعض خصوصیات !"

"میں کم دبیش شفقت کی صلاحیت رکھتا ہوں ۔ میری بیوی بہت ذہین اور انتظامی امور کی ماہر ہے ۔ ہم زیادہ قوی نہیں اور ہم دونوں ہی اعصابی طبیعت کے مالک ہیں" . . . ." ہماری شخصیات کے کئی پہلو ایک دوسرے سے بالکل نہیں ملتے ۔ میرے خیال میں وہ فیصلہ کرنے میں نہ صرف جلدبازی کرتی ہے بلکہ اس کا فیصلہ عقل واستدلال کی بجائے احساسات کا پیدا کردہ ہوتا ہے ۔ جب کہ میں موروثی خصائص کے باعث اپنے فیصلوں کی بنیاد آہستہ روی اور غیرجانبدارانہ منطق پر استوار کرتا ہوں اس کا نتیجہ میری بیوی کی مستقل نکتہ چینی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ میں کس قدر دھیما اور سست ہوں" . . . . ." میری بیوی اور مجھ میں اختلافِ طبائع کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں" . . . . ." سب سے بڑی بے اطمینانی طبیعتوں کے اختلافات کی پیدا کردہ ہے ہم میں ایک جوڑے میں موجود ہونے والے تمام ممکنہ اختلافات پائے جاتے ہیں ۔"

"میری بیوی مجھے بے حد بور کرتی ہے ۔"

"میری بیوی اور میرے اشتغال اور ذوق میں کوئی قدرِ مشترک نہیں ۔ گو ہم دونوں ہم رنگ اور ہم مزاج ہیں لیکن پھر بھی ہم ایک ایسی اشیاء سے دلچسپی نہیں لیتے" . . . ." میرے خیال میں سب سے بڑی وجہ باہمی اعتماد کا فقدان ہے مجھے یہ عجیب سا احساس ہوتا ہے کہ میری بیوی مجھ سے خوش نہیں اور اس سے ایک عجیب طرح کی بے چینی میں مبتلا رہتا ہوں ۔ میری کے الفاظ میں شخصیات میں ایک قسم کی چپقلش — ایک طرح کی ہیجانی غیرذمہ داری !

. . . ." سب سے زیادہ اہمیت اس امر کی ہے کہ ہم دونوں کے طرزِ فکر میں مماثلت نہیں ۔ ہماری ہر بحث ذاتیات پر منتج ہوتی ہے ۔ اس معاملہ میں میں خود کو قصوروار نہیں سمجھتا مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے اپنی رائے ٹھونسنے والا سمجھتے ہوئے ذہنی لحاظ سے دفاعی انداز اپنا لیتی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم بقدرِ ضرورت معاملات پر بحث نہیں کرتے مجھے بحث مباحثہ سے بہت دلچسپی ہے اگر ہم زیادہ [illegible] طور سے گفتگو کرسکتے تو ہماری زندگیاں زیادہ خوشگوار طریقہ سے بسر ہوتیں مثلاً میں مسز "ڈ" کے ساتھ تو بڑی آزادی سے بحث مباحثہ کرلیتا ہوں لیکن اپنی بیوی کے ساتھ ایسا ممکن نہیں" ۔

"یہ امر باعثِ کوفت ہے کہ میری بیوی میرے احباب کو پسند نہیں کرتی" . . . ." میں لوگوں سے جلدی گھل مل جانے والوں میں سے ہوں اور میری سماجی زندگی بھی ہے ۔ میں بہت جلد دوست بنا لیتا ہوں لیکن میری بیوی ایسا نہیں کرسکتی وہ بہت کم گو ہے اور مجھے یقین ہے کہ میری مانند وہ میل ملاپ سے کسی طرح کا لطف نہیں محسوس کرتی ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ موجب تنازع ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ بعض اوقات یہ غیرضروری بدمزگیوں کا باعث ضرور بنتا ہے"

"میرے خیال میں ایک وجہ تو ساس کی گھر میں موجودگی ہے" . . . ." اب تو میرا دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن ۔ جب میں ابھی لڑکا ہی تھا ۔ جب راتوں کو میرے والدین اور رشتہ کا ایک بھائی بیٹھ کر مجھ سے کتاب سنا کرتے تھے اس خاموش فضا میں خوش ذوقی، محبت اور تحسین تھی اور میں ان سب کا مرکز تھا ۔ کم ازکم میں اپنی ماں کو آسودگی تو پہنچا رہا تھا !"

"سب سے پہلی وجہ تو یہی ہے کہ میں دوسروں پر اپنی مرضی نافذ کرنے والوں میں سے ہوں اور یہی حالت میری بیوی کی ہے ۔ اس نے میری دلچسپیوں میں کبھی اس دلچسپی کا اظہار نہیں کیا جو سکونِ ذات کی اساس بنتی ہے بعض اوقات میں جب اس میں صاف باطنی

نہیں پاتا تو مجھے دکھ ہوتا ہے بلکہ میں تو اسے ذہنی بد دیانتی سے موسوم کروں گا۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ میں نے آج تک ذہنی لحاظ سے اسے اپنا مساوی تسلیم نہیں کیا۔ ہم میں ہم آہنگی نہیں ہے۔ اس نے آج تک میری ذاتی خوبیوں کو نہیں سراہا اور مجھے یقین ہے کہ اسے بھی مجھ سے یہی شکایت ہوگی۔ میں دن میں کم از کم ایک مرتبہ اس کی ضرور تعریف کر دیتا ہوں لیکن بعض اوقات تعریف کرنی بڑی مشکل ہو جاتی ہے خصوصیت سے اس وقت جب اس نے بے ڈھنگا اور بد وضع لباس پہن رکھا ہو اور ایسا عموماً ہوتا ہے"۔ ۔ ۔ ۔ "میں گھر کی فروعی الجھنوں سے تھوڑی نجات پاکر سماجی زندگی سے لطف اندوزی کے حق میں ہوں جب کہ میری بیوی امور خانہ داری اور بچوں سے باہر اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتی۔ مجھے اس سے بمقدور اہلیت ذہنی رفاقت اور بعض اوقات جسمانی رفاقت بھی نہیں ملتی"۔

"شادی کے فوراً بعد ہی گھریلو معاملات میں بیوی کے پھوہڑپن کا احساس ہوگیا۔ میرا پہلا گھر بہت صاف ستھرا ہوتا تھا۔ میری ماں سلیقہ شعار تھی وہ ہر چیز کو اس کی مخصوص جگہ پر رکھتی لیکن میری بیوی بہت لاپرواہ اور گندگی پسند ہے"۔

"بیوی کی خراب صحت اور بچوں کی پیدائش کا خوف"۔ ۔ ۔ ۔ "بچوں کے خوف نے ہماری جنسی زندگی تلخ کر دی ہے"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں کہ میں آج تک یہ محسوس ہی نہ کر سکا کہ نارمل جسمانی تعلقات کیسے ہوتے ہیں؟"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "پہلی وجہ بچوں کی عدم موجودگی، دوسری ناآسودہ جنسی زندگی!"

"جنسی، کچھ مشکلات تھیں۔ ذہنی — حسد اور ایک طرح کی تنگ نظری اور اسی لئے ہمارا سکھ چین حرام ہوگیا۔ میں حاسد نہیں۔ ہم یہ سمجھ گئے کہ اب گزارا ممکن نہیں رہا"۔ ۔ ۔ "میری بیوی کی حاسدانہ طبیعت فساد کی جڑ ہے"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "میری بیوی نے ہذیان میں پانچ سو عاشقوں کی خواہش ظاہر کی اور میں غصہ، حسد اور بے چارگی کے احساس سے پاگل سا ہوگیا"۔ ۔ ۔ ۔ "مجھے بہت کچھ کہنا ہے سب سے پہلے تو یہ کہ زندگی کے بارے میں ہمارے نقطۂ نظر میں یکسانیت نہیں ملتی۔ وہ مادی قدروں کو اہمیت دیتی ہے جب کہ میں سرگرمی سے زندگی بسر کرنے کے حق میں ہوں۔ میں زندگی سے مادی اشیاء کی بیدخلی کا حامی نہیں۔ وہ بہت زیادہ حاسد ہے اسے میرے کام سے ہی نہیں بلکہ احباب سے بھی جلن ہوتی ہے۔ اس کے خیال میں یا تو میری تمام واقف خواتین مجھ پہ ڈورے ڈالنے کی فکر میں ہیں اور یا میں انہیں پھانسنے کی تیاری کر رہا ہوں۔ دوسری وجہ یہ کہ وہ میرے احباب کے مقابلہ میں اس بنا پر احساس کمتری کی شکار ہے کہ وہ سبھی زندگی میں اہم مقام رکھتے ہیں وہ تو ان سے بات کرتے وقت خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ ویسے ان میں سے بعض نے بھی ہمدردانہ رویّہ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے ہر طرح سے ہراساں کرنے کی کوشش کی"۔

"کوئی چیز ٹھیک ہی نہیں!"

۴

شادی میں طبیعتوں اور جسمانی مطابقتوں سے قطع نظر — گذشتہ دو نسلوں سے امریکہ میں اب شادی کے ضمن میں دو اور تقاضے بھی اہمیت اختیار کر گئے ہیں یہ ذہنی اور سماجی ہیں۔ اب ازدواجی جوڑوں میں ذہنی صلاحیتوں اور ذاتی بانکپن پر زور دینے کا رجحان قوی سے قوی تر ہوتا جا رہا ہے اس سے ان کی باہمی زندگی زیادہ پُر اثر، دلچسپ اور آسودگی بخش بنتی ہے اور ان ہی کی وساطت سے وہ خارجی دنیا میں اچھے اور دل خوش کن سماجی روابط استوار کر سکتے ہیں۔ آیئے اب اس کا جائزہ لیں کہ ان سو خاوندوں نے اپنی اپنی رفیقۂ حیات کو اس لحاظ سے کس حد تک موزوں پایا؟

پہلے سوال کے جواب میں پھوٹ پڑنے والے انداز سے، شکایات کرنے والے مردوں میں سے پانچ کے خیال میں بیویوں یا (عمومی طور سے) شادیوں نے ان کی سماجی زندگی کا بیڑہ غرق کر دیا۔ گیارہ مردوں نے اپنی بیویوں کو ان ذہنی صلاحیتوں سے عاری پایا جن کی بنا پر سماجی یا ذہنی تسکین حاصل کی جا سکتی ہے اور عورتیں اچھے پیشے اختیار کر سکتی ہیں۔ تین مردوں نے اپنے اور اپنی بیویوں کے سماجی، تعلیمی اور ثقافتی پس منظر میں فرق کی شکایت کی۔ اس مسئلہ پر مزید روشنی اس خاص سوال سے بھی پڑتی تھی۔ "کیا آپ اور آپ کی بیوی ذہنی اور جسمانی لحاظ سے بھی موزوں رفیق ہیں یا نہیں؟" مجموعی لحاظ سے یہ سو مرد ذہن کے مقابلہ میں سماجی لحاظ سے زیادہ بہتر رفیق تھے۔ ان میں سے تین چوتھائی نے بلا جھجک اپنی شادی کو سماجی لحاظ سے کامیاب تسلیم کیا۔ جب کہ نصف سے قدرے زیادہ مردوں نے یہی کچھ ذہنی رفاقت کے بارے میں بتایا۔ ایسے مردوں کی بھی خاص تعداد تھی جو دونوں کے بارے میں واضح قسم کے جوابات نہ دے سکے۔ صرف گیارہ مردوں نے بیوی کی سماجی عدم رفاقت کی شکایت کی جب کہ بیس مردوں کے خیال میں ان کی بیویاں اچھی ذہنی رفیق نہ ثابت ہو رہی تھیں۔ اب اسے انسانی فطرت کی کمزوری ہی سمجھنا چاہیے کہ ہر موقع پر خاوند نے بیوی ہی کو قصوروار ٹھہرایا۔

۵

ان بے اطمینان خاوندوں کو اپنی شادی کی خامیوں — شدید اور تکلیف دہ خامیوں — کا کب احساس ہوا؟ کیا یہ شادی میں مطابقت کا پہلا سال ہوتا ہے جس میں مرد اپنے انتخاب کی درستی کے بارے میں سوچ بچار شروع کرتا ہے؟ یا شادی کے اولیں پُر مسرت ایام گزر جانے کے بعد ان میں بے چینی اور بے کلی کا آغاز ہوتا ہے؟ ان سو میں سے تقریباً نصف نے بتایا کہ انہوں نے کبھی بھی شدید قسم کی بے اطمینانی نہ محسوس کی تھی۔ تیرہ حضرات کے جوابات مبہم اور غیر واضح تھے۔ بقیہ ۳۴ خاوندوں میں سے تین چوتھائی نے شادی کے پہلے سال کے اختتام سے قبل ہی اپنی شادی کی بے اطمینانیوں کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں یہ امر باعث دلچسپی ہے کہ سات مرد منگنی کے دوران ہی میں ان کی "خامیوں اور کوتاہیوں کے باعث شدید بے اطمینانی" محسوس کرتے تھے جب کہ آٹھ کا جواب تھا — "آغاز سے ہی!"

گو پہلے سوال کے جواب میں ۳۹ مردوں نے اپنی بیویوں کو ہر لحاظ سے قابلِ اطمینان قرار دیا تھا اور جب کبھی بھی اس موضوع پر بلاواسطہ قسم کا سوال کیا جاتا تو ان کے جوابات قابلِ اطمینان شادیوں کے اعلیٰ تناسب کے مظہر بن جاتے۔ اسی نوعیت کا ایک سوال یہ تھا: "تم محض اپنی محبت کی خاطر اپنی بیوی کے ساتھ مستقل زندگی بسر کرنے کے خواہاں ہو؟" ۲۵ فیصد مردوں کے جوابات: — "ہاں — یا "صرف یہی وجہ ہے؟"

اگلا سوال جو تمام مردوں اور عورتوں ہی کو پسند آیا۔ یہ تھا۔ "اگر ایک بٹن دبانے سے یہ معجزہ رونما ہو سکے کہ تم کبھی بھی اپنی بیوی سے رشتہ ازدواج میں منسلک نہ تھے۔ کیا تم بٹن دبا دو گے؟" یہ ایسا سوال تھا کہ ڈرپوک سے ڈرپوک اور محتاط سے محتاط انسان بھی جرم یا زیادتی کا احساس کیے بغیر آزادانہ جواب دے سکتا تھا۔ تاہم ۷۶ مردوں نے فوراً غیر مشروط نفی میں جواب دیا۔ مزید آٹھ نے مشروط انکار کیا۔ پانچ غیر یقینی تھے۔ کل ۱۱ خاوند ایسے تھے جو شادی ختم کرنے کو تیار تھے۔

ایک اور سوال میں رفیقۂ حیات کی پیدا کردہ بے اطمینانی کا نہیں بلکہ بحیثیت ایک سماجی ادارہ کے شادی کی بے اطمینانی کا جائزہ لینا مقصود تھا۔ سوال یہ تھا: "اب جب کہ تم شادی کے بارے میں سب کچھ جان چکے ہو تو پھر کنوارہ ہونے کی صورت میں شادی کرتے؟" ۷۷ مردوں نے اثبات میں جواب دیا۔ پانچ اور نے مشروط "ہاں" کی۔ صرف گیارہ کا جواب "نہیں" یا مشروط نفی تھا۔

تحقیق کے آخری مراحل میں پہلا سوال پھر آگیا اور اس مرتبہ ۷۷، مردوں نے اپنی شادی سے کسی قسم کی بے اطمینانی کا اظہار نہ کیا۔ اگلے سوال میں مردوں سے ان کی شادی کی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں استفسار کیا گیا تھا۔ ۱۳ نے اپنی شادیوں کو "غیر معمولی کامیاب" بتایا۔ یا اس سے ملتے جلتے خیال کا اظہار کیا۔ ۴۳ کی شادیاں "کامیاب" تھیں۔ ۴۴ نے مشروط نفی سے اپنی شادیوں کو ناکامیاب قرار دیا۔ گویا جائزہ لینے والوں کی رائے کے برعکس ہی سہی - ۲۷ مرد خود کو معقول طریقہ سے آسودہ سمجھ رہے تھے۔

اس کا یہ مطلب ہوا کہ خاوند اب اپنی شادیوں سے آسودہ سے آسودہ تر اور جائزہ لینے والوں کے خیال سے بھی بڑھ کر خوش تھے کیونکہ ان کے خیال میں انہیں اتنا مطمئن اور آسودہ نہیں ہونا چاہیے۔ سینکڑوں سوالات اور درجن ملاقاتوں کے بعد بہت کم لوگ ـــ تعجب خیز حد تک ـــ اپنی شادی سے بہت زیادہ غیر مطمئن نہ تھے انہوں نے گزشتہ زندگی اور یادوں کا جائزہ لیا اور ان سب کو قابل اطمینان تصور کر رہے تھے۔

اسی جائزہ سے ایک بڑی دلچسپ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ جیسے جیسے مردوں کو اپنی شادی کی معقول مسرت دہی کا یقین ہوتا گیا ویسے ویسے ہی بیویوں کی خامیوں اور کوتاہیوں پر ان کی تنقید میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس جائزہ کے آغاز کرنے والا سوال وسط اور اختتام پر بھی دہرایا گیا تھا۔ پہلے سوال کے جواب میں ۳۹ آدمیوں نے اپنی شادیوں کو بے اطمینان نہ پایا تھا۔ جب یہ سوال دوسری مرتبہ دہرایا گیا تو یہ تعداد کم ہو کر ۳۷ رہ گئی اور اختتام پر صرف ۲۲ مرد ایسے تھے جو اپنی بیویوں میں شدید خامیاں تلاش نہ کر سکے۔

۶

یہ تو حقائق کا ان سو مردوں کے خیالات کی روشنی میں جائزہ تھا۔ لیکن ابھی جائزہ لینے والوں کو اپنی رائے کا بھی اظہار کرنا ہے کہ چار سالہ تحقیقات کے بعد ہم کس نتیجہ پر پہنچے ہیں!

ان مردوں کو اپنی شادیوں میں بے حد خامیاں نظر آتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے جو کچھ کہا اس کے پس منظر کی تلاش بھی ضروری تھی۔ بے اطمینانیوں پر مبنی خیالات کا تجزیہ بھی لازم تھا۔ اس لیے ان کے ایام طفلی کا تصور بہت ضروری تھا۔ جب وہ حساس تھے اور والدین کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک فعل انہیں المناک حد تک متاثر کر دیتا تھا۔ بہت سے بچے والدین کے سکھائے ہوئے خوف سے مفلوج تھے انہیں اپنی فطری، صحت مندانہ اور نارمل جسمانی خواہشات سے خوفزدہ ہونا سکھایا گیا تھا۔ بلوغت کے بعد جب انہوں نے شادیاں کیں تو اس خوف نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ ان خوفوں نے ان داخلی پژمردگیوں کو جنم دیا جو شادی سے ہیجانی اور جسمانی تسکین کے حصول میں رکاوٹ کا باعث بنتی تھیں۔ بچپن میں انہیں ان فطری تقاضوں کو ممنوع قرار دے کر ان کا وجود تسلیم نہ کرنے کی تلقین کی گئی تھی۔ اس لیے جب انہیں اپنی شادی سے وہ ہیجانی اور جسمانی آسودگی میسر نہ آتی جس کے وہ بنیادی طور سے خواہاں تھے تو انہیں یہ علم نہ تھا کہ قصور ان کا اور ان کے والدین کا ہے۔ وہ اس بدقسمتی کا باعث اپنی رفیق کو ٹھہراتے ہوئے تمام الزام بیویوں کے سر منڈھ رہے تھے۔

"میری شادی کیوں ناکام ہوئی؟"

ـــ سو بیویوں کا اعتراف ـــ

ہمارا پہلا سوال ہی اچھا خاصہ چیلنج تھا: "آپ کی شادی میں ایسی کیا خامی ہے۔ جو خصوصیت سے بے اطمینانی کا باعث بنتی رہتی ہے؟"

اس سوال نے مردوں اور عورتوں میں ایک امتیازی خط کھینچ دیا۔ ۳۹ مردوں کے مقابلہ میں ۲۵ عورتوں نے نفی میں جواب دیا۔ ۴۵ عورتوں کی ازدواجی زندگی قابل اطمینان اور مسرور تھی اور ان میں سے تقریباً نصف کے خیال میں ان کی شادی میں کوئی سنجیدہ قسم کی خامی تھی جب کہ ان کے مقابلہ میں مسرور ازدواجی زندگی گذارنے والے مردوں کی تعداد صرف ایک تہائی بنتی تھی۔ مرد اور عورت کی بے اطمینانیوں کی تعداد ـ دو سو سے زائد ـ یکساں تھی اسی طرح جن مختلف اشیاء کے بارے میں شکایات کی گئی تھیں ان کی تعداد ـــ تینتالیس ـــ بھی یکساں تھی مردوں کے مقابلہ میں زیادہ عورتوں نے چڑچڑاہٹ پیدا کرنے والی صرف ایک چیز کا حوالہ دیا۔ اسی طرح مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی فہرست شکایات زیادہ طویل تھی ایک بیوی کو کم از کم پندرہ قسم کی شکایات کا رونا تھا۔ لیکن اور بیویوں کی شکایات کی تعداد سب سے زیادہ جھگڑالو مردوں کی شکایات کے مساوی بنتی تھی۔

پہلے سوال نے بارود میں چنگاری کا کام کیا اور مرد یا عورت کی ذہنی حالت کا اندازہ لگانے کے لیے بلاشبہ یہ سوال بہترین کسوٹی ثابت ہوا۔ علاوہ ازیں سوالات کے جوابات کے بغور مطالعہ سے یہ بھی واضح ہوا کہ پہلی شکایت یا بے اطمینانی سب سے زیادہ اہم مستقل اور دور رس نتائج کی حامل ثابت ہوئی اور ۵، غیر مطمئن عورتوں کی اکثر بے اطمینانیاں اوّلیں شکایت کے رنگ میں رنگی ملتی ہیں۔

اکثر خصوصیت سے مسرور ازدواجی زندگی گزارنے والی ۲۵ عورتوں ـ کے جوابات صاف اور واضح تھے لیکن بعض جوابات بے چینی اور پریشانی کے غماز ہونے کی وجہ سے مبہم، غیر واضح اور الجھے ہوئے تھے۔ ان کی حالت اس شخص سے مشابہ تھی جو نیم خوابیدہ حالت میں جسمانی تکلیف محسوس کرنے کے باوجود اس کی نوعیت سمجھنے سے قاصر ہو۔ ان کے گول مول جوابات سے بس اتنا پتہ چلتا تھا کہ انہیں ازدواجی تعلقات میں بعض خامیوں کا احساس ہے لیکن اس "احساس" کی وہ مزید تشریح و توضیح کرنے پر قادر نہ تھیں۔

ـ : ۲ : ـ

جب واضح اور مخصوص قسم کی بے اطمینانیوں اور الجھنوں کا جائزہ لیا جائے تو جنسی الجھنوں کو دیگر الجھنوں پر نمایاں فوقیت ملتی ہے۔ پہلے سوال کا جواب دیتے وقت ۱۸ عورتوں کے ذہن میں اس الجھن کو اوّلیت حاصل تھی۔ بعض کے جوابات تو بالکل سیدھے اور سادہ سے تھے "جنسی بے اطمینانی ـــ اسے اساسی حیثیت حاصل ہے"۔ لیکن سب کے جوابات ایسے بے تکلفانہ اور سادہ نہ تھے بلکہ بعض کے جوابات میں سچائی کو کئی پرپیچ مراحل طے کرتے ہوئے کئی طرح کے الجھے ہوئے رشتوں کی نقاب کشائی کرنا پڑی تھی۔ ایک عورت اس حقیقت سے باخبر تھی کہ وہ خود ہی جنسی لحاظ سے برف ہے لیکن اپنی اس سرد مہری کے باوجود وہ جذباتی اور پرجوش طبیعت کی مالک تھی اور اپنے خاوند سے شدید محبت کرتی تھی۔ وہ بھی اس سے ویسی ہی محبت کرتا تھا۔ ان میں چھوٹی بڑی باتوں پر جھڑپ چلتی رہتی تھی۔ وہ اپنے جنسی تقاضوں کی تکمیل کا متمنی ہوتا۔ جنہیں وہ چاہنے اور کوشش کے باوجود بھی آسودہ نہ کر سکتی۔ اپنی اس ناکامی پر وہ بہت زیادہ کڑھتی اسے اپنی اس خامی کا شدید احساس تھا۔ اپنے خاوند کے غصے اور دکھ سے بھی زیادہ مگر وہ بے بس تھی۔ ایک اور عورت کو اپنے اندر جسمانی توانائی کی کمی کا احساس تھا! "مجھے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ میں ہمیشہ سے ہی نامراد رہی ہوں کیونکہ میں نے کبھی بھی اپنے خاوند کے لیے جذباتی اور ہیجانی قسم کی وابستگی نہ محسوس کی۔ میں نے شروع سے ہی اس خامی کو محسوس کر لیا تھا کہ محبت گویا میرے تمام جذبات کا گلہ گھونٹ دیتی ہے جب کہ میرا خاوند بالکل میرے برعکس ہے۔ اور یہی فساد کی جڑ ہے!" ایک اور عورت نے یوں لکھنا شروع کیا: "کتنا بڑا سوال!" اس کے بعد جنسی

اور پھر طویل وقفہ" ہماری جنسی زندگی بے حد غیر مطمئن رہی ہے۔ ہم لوگوں میں مطابقت نہ پیدا ہو سکی جس کے نتیجہ میں چھوٹی بڑی کئی الجھنوں اور پریشانیوں نے جنم لیا۔ حتیٰ کہ بالآخر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ میرا خاوند میرے ڈھب کا مرد نہیں اور میں اس کے ساتھ باقی زندگی نہیں گزار سکتی۔ اس میں پدرانہ شفقت بہت زیادہ ہے اور اسے ہمیشہ میری صحت کا غم کھاتا رہتا ہے وہ اس قسم کا مرد نہیں جو کسی عورت کے "خفتہ ناز" کے لیے "تازیانہ" کا کام کر سکے۔ نہ جانے مجھے جنسی معاملات میں خارجی تہیج کی حاجت کا کیوں احساس ہے؟"

اگر ان دو صد مردوں اور عورتوں کے جوابات امریکہ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی حالت کے ترجمان ہیں تو پھر اس ملک کا خدا حافظ ہے۔ جنسی عدم آسودگی کی شکایت کرنے والی ۱۸ عورتوں نے اس ضمن میں اپنی خامیوں اور عدم مطابقت کو تسلیم کیا جب کہ باقی چار کے خاوندوں کا قصور تھا۔ مزید مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ان چودہ کی چودہ عورتوں کا بچپن سخت رجعت پسندانہ اور کٹر قسم کے ماحول میں گزرا۔ جنس ان کے لیے گناہ اور شر تھی اور اس لیے اب وہ شادی کے بعد صحت مند اور نارمل جنسی زندگی گزارنے کے نااہل ٹھہریں۔ خدا جانے اور کتنی امریکی عورتیں اپنے ماں باپ کے "نیک گناہوں" کی سزا بھگت رہی ہیں۔

—: ۳ :—

جب ان عورتوں کی جسمانی شکایات کے ساتھ ساتھ طبیعتوں کی پیدا کردہ الجھنوں کو دیکھا جائے تو وہ دوسرے نمبر پر آتی ہیں۔ صرف ۹ عورتوں نے خاوندوں کی ہم ذوقی اور ہم مذاقی کی شکایت کرتے ہوئے اسے اوّلین اور اساسی اہمیت دی تھی۔ یہ مردوں کے بالکل متضاد ہے کیونکہ صرف ۱۲ مردوں نے ازدواجی الجھنوں کا باعث جسمانی وجوہات کو بتایا جب کہ سولہ نے طبیعتوں کے اختلافات کو اہمیت دی۔ اب یہ واضح حقیقت خارج از بحث سمجھی جائے کہ جسمانی لحاظ سے آج کے مرد میں عورت کی نسبت ازدواجی جنسی تعلقات سے آسودگی حاصل کرنے کی نسبت کہیں زیادہ صلاحیت ہے۔ یہاں ایک مرتبہ پھر اس امر پر زور دے دیا جائے کہ اعصابیت کے شکار یا کٹر مذہبی خیالات کے حامل والدین خصوصیت سے اپنی بیٹیوں میں ان تمام جبلتوں کو کند کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کی صحت، جسم اور نظام عصبی کی نشو و نما کے لیے ناگزیر ہوتی ہیں۔

جن نو عورتوں نے اختلافات طبائع و مذاق کو اوّلین وجہ قرار دیا تھا ان سب نے مختلف الفاظ میں تقریباً ایک ہی مفہوم ادا کیا۔ "ہم میں زاویہ نگاہ اور مقصد کی یکجہتی نہیں۔ مجھے اپنی طمانیت کے لیے متضاد قسم کی خواہشات درکار ہیں۔" بعض نے خاوندوں کو موردِ الزام گردانا۔ جب کہ بعض نے — اس عورت کی مانند — اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کیا "مصیبت یہ ہے کہ ہم دونوں چیزوں کو ایک ہی زاویہ سے نہیں دیکھتے۔ شاید ہی کسی بات پر ہم میں اتفاق رائے پایا گیا۔ غلطی زیادہ تر میری ہوتی ہے۔" اب ایک ایسی عورت کی بھی سنئے جس نے سارا الزام خاوند کے سر تھوپ دیا ہے: "اب میں اس حالت کو پہنچ چکی ہوں کہ میرا خاوند مجھے بہت بور کرتا ہے بلکہ میں تو کافی عرصہ اس سے بور ہوتی آ رہی ہوں۔ دراصل وہ بہت ہی غیر دلچسپ اور روکھا پھیکا مرد ہے" ایک اور یوں رقم طراز ہے: "مصیبت یہ کہ اسے گھر اور اس کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں وہ گھر میں رہ کر خاموشی سے کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ اچھے "ساتھی" کی حیثیت نہیں رکھتا۔ مجھے اس بے اطمینانی کے بارے میں یوں زیادہ تشویش ہے کہ میں اس کی بنیادی وجہ سے باخبر ہوں وہ دیہات کا رہنے والا ہے اور وہ لوگ عورت کو کسی اور ہی روشنی میں دیکھتے ہیں اس لیے وہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی خود سے فرار نہیں حاصل کر سکتا۔" بعض عورتوں نے دونوں کی خامیوں کو گنوایا یا کم از کم اتنا تو ضرور تسلیم کیا کہ طبیعتوں کے ان اختلافات میں لچک نہیں پیدا کی جا سکتی۔ "مختلف مواقع پر مختلف قسم کی بدمزگیاں ہوتی رہتی ہیں اس وقت اگر کوئی خاص دقت ہے تو وہ اختلافِ طبع ہے وہ محتاط اور مستعد قسم کا مرد ہے جب کہ میں ذاتی ایکی اور ذہنی ترنگ کی قائل ہوں۔ اس لیے بعض اوقات ہم ایک دوسرے کے رویہ کو صحیح روشنی میں نہیں دیکھ سکتے جس سے کبھی کبھار اچھی خاصی بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے۔ عموماً اس کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جاتی ہے جس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ وہ ابھی تک مجھے نہیں سمجھتا۔ مجھے تخلیقی ذہن پسند ہے لیکن وہ ایسا نہیں۔ میں علت میں دلچسپی لیتی ہوں جب کہ وہ نتائج سے سروکار رکھتا ہے" گو اس میں قدرے تنقیدی پہلو موجود ہے لیکن اس عورت نے تو واضح الفاظ میں اپنے خاوند کی کوتاہیوں پر اظہارِ خشونت کیا ہے: "وہ ذہن اور عقلی لحاظ سے میرا صحیح معنوں میں رفیقِ حیات نہیں بن سکتا۔ اس کی دلچسپیوں کا میرے اشغال سے کوئی تعلق ہی نہیں — وہ بلا کسی معقول وجہ ایک بچہ کو ناپسند کرتا ہے جب کہ باقی بچوں کو وہ مجھ سے بھی زیادہ چاہتا ہے جن لوگوں کو میں پسند کرتی ہوں وہ انہیں ناپسند کرتا ہے اس نے میرے احباب کی کبھی بھی پرواہ نہیں کی بلکہ وہ تو ان سے بد اخلاقی کا سلوک کرتا ہے۔"

جنسی عدم مطابقت کے ضمن میں بھی بعض عورتوں نے اختلافِ طبع پر خاصہ زور دیا۔ عورتوں — کم از کم اس تحقیقات کے دائرہ میں آنے والی عورتوں کے لیے شادی میں جسمانی مطابقت کی اہمیت اس سے بھی واضح ہو جاتی ہے کہ سات عورتوں کے خیال میں یا تو ان کے خاوند جنسی بے وفائی کے مرتکب ہو چکے تھے یا پھر وہ ایسا کرنے والے تھے بعض بیویوں کے دل میں محض شکوک تھے اور وہ ان کی بنا پر کرب ناک حالت میں تھیں جب کہ بعض کو یہ معلوم تھا "اب" میری کوئی پرواہ نہیں کرتا اور نہ ہی وہ میری احتیاج محسوس کرتا ہے۔ میرے خیال میں یہ کسی "دوسری" عورت کی وجہ سے ہے۔ وہ بچہ کو پوجا کرنے کی حد تک چاہتا ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے گویا اس نے تمام محبت کا مرکز اس بچہ کو بنا لیا ہے اور گھر سے باہر ایک بیوی تو اس نے ڈھونڈ بھی لی ہے۔" کئی عورتیں کسی زمانہ میں میاں بیوی کے لیے جنسی آزادی پر یقین رکھتی تھیں لیکن اب وہ اپنے خاوندوں کی زندگی میں کسی اور عورت کا وجود برداشت نہ کر سکتی تھیں۔ گو خاوندوں نے اپنی بیویوں کے بیرونِ خانہ جنسی تعلقات کی شکایات نہ کیں۔ لیکن ایسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آسانی سے سب کچھ کر گزرتے تھے۔ ایک بیوی نے لکھا۔ "میں جذباتی لحاظ سے ناخوش ہوں۔ کیونکہ وہ دوسری عورتوں کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے مجھے سب سے زیادہ اس بات کی کوفت ہے کہ اس نے کسی کے ساتھ مستقل تعلقات استوار کر رکھے ہیں حالانکہ میں نے خود بھی یہی حرکت کی ہے"

یہ تخمینہ غلط نہیں ہو گا کہ ان خواتین کی، مانند ۵ فیصد امریکی عورتوں کے لیے خانہ داری ایک وبال ہے اور وہ گھریلو زندگی کے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے خود میں فروعی تبدیلیاں پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہیں ۵ عورتوں کی شکایات اسی نوعیت کی تھیں ان ہی میں سے نے ازدواجی "بندھنوں" کا رونا رویا تھا۔ ایک عورت نے لکھا: "مجھے گھر گرہستی پسند بھی ہے اور میں اس سے متنفر بھی ہوں گو مجھے اپنی ملازمت کی یاد ستاتی ہے لیکن پھر بھی مجھے کھانا پکانے اور سینے پرونے سے دلچسپی ہے لیکن میں انہیں کرنے کے لیے مجبور اور پابند ہوں اس لیے مجھے ان سے نفرت بھی ہے" "ایک دوسری" میرے لیے تو دنوں کی یکسانیت اکتاہٹ اور بے اطمینانی کا باعث ہے مجھے مستقبل کے لیے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ ایسے بھی جوڑے ہیں جو دس دس اور بیس بیس سال کی شادی کے بعد بھی تاش اور چائے کی پارٹیوں میں جا رہے ہیں — میرے خیال میں مستقبل میں اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔" "میرے لیے بے اطمینانی کا موجب کولہو کے بیل ایسی زندگی ہے مجھے اس سے سخت نفرت ہے۔ ازدواجی تعلقات تو ٹھیک ٹھاک ہوتے ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ ذمہ داری اور

کہنہ روایات کی پابندی کا بوجھ ناقابل برداشت ہوتا ہے۔"

— : ۴ : —

ان سو مردوں اور عورتوں میں سے پانچ ایسی تھیں جن کے رفیق حیات یا تو بچکانہ طبائع کے مالک تھے اور یا پھر وہ ذہنی یا ہیجانی پختگی کو نہ پہنچے تھے۔ ایک عورت نے لکھا: "گو ہماری شادی کو بارہ سال گزر چکے ہیں لیکن میرے خاوند میں ابھی تک پختگی نہیں آئی۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ شادی کے بعد سے اس کی ذہنی عمر میں قطعی اضافہ نہیں ہوا۔ اس وجہ سے تمام ذمہ داریوں کا بوجھ میرے کندھوں پر ہے وہ عملی نہیں۔ ایسے آدمی کے ساتھ جس میں خود اعتمادی کے بغیر انانیت ہو زندگی گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔" ایک عورت کے خاوند پر مردہ دلی اور پژمردگی کے دورے پڑتے تھے۔ "سارے فساد کی جڑ میرے خاوند پر پژمردگی کے دورے ہیں۔ گذشتہ سرما میں اس کی حالت کچھ ایسی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ سونے کی خواہش کرتا رہا۔ میں اس پر جھلا کر اس کے ساتھ الجھ گئی نتیجہ یہ نکلا کہ اس پر پھر وہی پژمردگی کا دورہ پڑا۔ وہ یوں خاموش اور گم سم ہو گیا گویا اس کے ساتھ بہت زیادتی اور ظلم ہوا ہو۔ اب وہ دن بھر سویا رہتا اور میں یہی سوچتی رہتی کہ میں نے اس کے ساتھ کیا زیادتی کی ہے لیکن مجھے اپنی کوئی غلطی نہ معلوم ہوئی۔"

بعض عورتوں کے لیے ان کے بچے پریشانیوں کا باعث تھے کیونکہ یا تو عورتیں بچہ پیدا نہ کر سکتی تھیں اور یا خاوند نہ ایسا چاہتے تھے۔ چار عورتوں نے اس شکایت کے ساتھ آغاز کیا تھا جب کہ ان کے مقابلہ میں صرف دو مردوں نے اسے اہمیت دی تھی۔ "ہمارا کوئی بچہ نہیں۔ میرا ایک ننھا سا بیٹا تھا لیکن اب وہ بھی نہیں رہا اور میرے خیال میں میرا خاوند بچے نہیں چاہتا" — "میں بچے نہیں پیدا کر سکتی" — "وہ مجھے بچے پیدا نہیں کرنے دیتا۔"

ایک عورت کی تمام بے اطمینانیوں اور پریشانیوں کا باعث یہ تھا کہ اس کا خاوند ہی اس کا بچہ بن کر رہ گیا۔ نہ اسے کوئی ذہنی بیماری تھی اور نہ ہی وہ جنبی تھا۔ لیکن پھر بھی اس میں اس مردانہ خود۔ شادی کا فقدان تھا جو ایک جیون ساتھی کی لازمی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ وہ ایک بچہ کی طرح اس کے سہارے کا محتاج تھا۔ "یوں سمجھئے کہ میرے خاوند نے میرے ساتھ شادی نہ کی تھی بلکہ میں اس کی خاوند تھی وہ مجھ سے عمر میں بہت کم ہے اور وہ قطعی ناپختہ ہے"۔

تین عورتوں کو یہ شکایت تھی کہ ان کے خاوندوں کی آمدنیاں ناکافی تھیں۔ ایک عورت نے یوں شکایت کی"۔ "مجھے تو صرف ایک ہی بات سے بے اطمینانی ہے کہ میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں آرام سے زندگی بسر کر سکوں۔ بچہ کی پیدائش تک اپنے چھوٹے سے مکان میں میں بے حد خوش و خرم زندگی بسر کر رہی تھی۔ لیکن اب ہم تین کمروں میں سما نہیں سکتے۔ ویسے مجھے اپنے خاوند سے کوئی گلہ نہیں۔ کیونکہ وہ تو حتہ المقدور محنت کر رہا ہے۔"

لیکن تین خاوند یقینی طور سے محنت نہ کر رہے تھے وہ پکے شرابی تھے اور ان کی بیویوں نے اس کو اولیت دی تھی۔

ایک عورت کی ناخوشی کا سبب اس کے خاوند کی ضرورت سے زیادہ خود غرضی تھی وہ اپنی محبت اور مشترکہ دلچسپیوں کے باوجود بھی ناخوش تھی کہ اس کے ذہن سے خاوند کی خود غرضی کا خیال نہ جاتا تھا۔

ایک خاوند ضرورت سے زیادہ خاموش پسند تھا اور اس کی بیوی کے لیے یہی بے اطمینانی کا باعث تھا۔ "وہ تو منہ بند سیپ ہے۔"

ایک عورت کے لیے کباب میں ہڈی خاوند کے کنبہ والے تھے۔ شور مچاتے بچوں اور بڑوں پر مشتمل یہ وسیع کنبہ ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔

اپنے خاوند کو دیوانہ وار چاہنے والی ایک اور عورت کے ذہن میں یہ حقیقت کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی کہ اس کا خاوند اسے نہیں چاہتا۔ مگر وہ اس کے بارے میں کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ ایک بیوی نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ اس کی ازدواجی زندگی کی کامیابی میں سب سے بڑی رکاوٹ خود اس کی اپنی خراب صحت ہے۔ وہ اس طرح کے کئی کام نہ کر سکتی تھی جو ان دونوں کی گھریلو خوشی کے لیے لازمی تھے وہ جانتی تھی کہ ایک تھکی ہوئی بیوی کے ساتھ زندگی گزارنا کوئی آسان کام نہیں اور ایسی بیویوں کے خاوند بھی قدرے بگڑ جاتے ہیں۔

— اور دو بیویوں کی یہ حالت تھی کہ وہ خود کو کسی دلدل میں پھنسی محسوس کرتی تھیں۔ "یہ سارا بکھیڑا ہی اس قدر الجھا ہوا ہے کہ میں کسی ایک چیز کو لے کر اسے وجہ نہیں قرار دے سکتی۔"

— : ۵ : —

بعض عورتیں خاوندوں کے انتخاب میں ہر لحاظ سے بدقسمت ثابت ہوتی ہیں مسئلہ یہ نہیں کہ ایک مرد کی خصوصیات ایک عورت کے ذوق پر بار ہیں۔ بہت سی عورتیں ایسی ہیں جو بلا سوچے سمجھے ایسے مردوں سے شادی کر بیٹھتی ہیں جو سرے سے کسی عورت کو خوش رکھ ہی نہیں سکتے۔ اس تحقیقات کی تقریباً ۱۵ فیصد عورتوں نے یہی غلطی کی تھی اور وہ اپنے خاوند کو شادی کی ناکامی کا باعث ٹھہرا سکتی تھیں۔ کیا تمام اونچے طبقہ میں یہی تناسب پایا جاتا ہے؟ شرابیوں سے شادی کرنے والی تین عورتیں جسمانی لحاظ سے ناکارہ مردوں کی چار بیویاں، کند ذہن اور ذہنی مریضوں کی پانچ بیویاں خود غرض گدھے سے بیاہی جانے والی ایک اور ایک وہ جس کا خاوند اپنے جذبات اور ہیجانات کے لحاظ سے ابھی طفلانہ حدود میں تھا۔ ان تمام عورتوں کی شادیوں کی ناکامی کا باعث یہ تھا کہ بدقسمتی سے یہ ایسے مردوں سے شادی کر بیٹھیں جو ازدواجی ذمہ داریوں کا بار اٹھانے کے اہل نہ تھے۔ شادی کی ناکامی میں دونوں فریقین کے ہاتھ کا ہونا لازمی نہیں۔ ہو سکتا ہے یہ تمام عورتیں حسن و خوبی، ایثار و محبت اور فہم و دانش کا مجسمہ ہوں لیکن ان کے خاوندوں کی بنیادی خامیوں نے ان چودہ گھرانوں کا ازدواجی سکھ چین لوٹ لیا۔

تمام شادیوں کو اس معیار پر نہیں پرکھا جا سکتا کیونکہ ایسی شادیوں کی اکثریت ہے جہاں جزوی یا کلی ناکامی کا باعث مشترکہ غلطیاں ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کی تصحیح ناممکن نہیں ہوتی۔ سترہ عورتوں نے جنسی تعلقات کو بے اطمینانی کا باعث قرار دیا ہے ان میں سے چودہ ایسی تھیں جن میں خود جنسی مطابقت کی صلاحیت نہ تھی۔ وہ جنسی لحاظ سے کبھی بھی حتیٰ کہ شادی کے ابتدائی زریں ایام میں بھی — مکمل آسودگی نہ حاصل کر سکیں۔ غالباً یہ ایسی عورتیں ہیں جنہیں کوئی مرد بھی اس درجہ تک نہیں پہنچا سکتا کہ یہ جنسی لحاظ سے اطمینان بخش مطابقت حاصل کر سکیں۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ان سو میں ایسی کئی عورتیں ہیں جو سالوں کی مشترکہ سعی کے بعد— مہینوں کے اختتام پر — بالآخر اپنا مقصود پا لیتی ہیں۔

— : ۶ : —

ان سو عورتوں کی شکایات کے تجزیہ کا ایک طریقہ ان عورتوں کا مطالعہ ہے جن کی شکایات کا صرف ایک ہی موضوع ہے۔ پندرہ مردوں کے مقابلہ میں ایسی عورتوں کی تعداد چھبیس بنتی ہے یاد رہے کہ زیادہ سے زیادہ شکایات کرنے میں بھی عورتوں

کی تعداد مردوں سے زیادہ تھی۔ صرف ایک شکایت کرنے والی عورتوں میں بھی جنس کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔

گو ایک تہائی سے زیادہ عورتوں نے صرف ایک ہی شکایت پر اکتفا کی تھی۔ لیکن باقیوں کی شکایات تعداد میں زیادہ ہونے کے ساتھ ساتھ متنوع موضوعات سے تعلق رکھتی تھیں۔ کل شکایات ۲۳۳ بنتی ہیں اور جداگانہ تذکرہ کے بجائے انہیں مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کر دیا ہے۔ مندرجہ ذیل نقشہ میں کسی ایک عورت کی شکایات نہیں بلکہ ان سو عورتوں کی تمام شکایات جمع کر دی گئی ہیں۔ تقابل کے لیے مردوں کی شکایات بھی درج ہیں۔

	عورتوں کی شکایات	مردوں کی شکایات
اختلاف طبع	۳۷	۴۹
جنسی ناآسودگی	۳۰	۲۹
گھریلو غلامی یا نجی آزادی کا فقدان	۱۸	۱۰
اقتصادی مشکلات	۱۶	۸
محبت کی کمی	۱۳	۰
رقابت	۱۱	۸
سب طرح کی خرابیاں	۱۰	۲
بچوں کی پیدا کردہ مشکلات	۷	۸
خراب صحت	۵	۱۰
پیشہ میں شادی کی رکاوٹ	۵	۲
رشتہ داروں کی وجہ سے چپقلش	۴	۷
...کے باعث سماجی زندگی میں رکاوٹ	۲	۵
[illegible]	۳	۰
متفرقات	۲	-

اس نقشہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عورتوں کو جنس کے مقابلہ میں اختلاف طبع کی زیادہ شکایات ہیں لیکن اس معاملہ میں مردوں کو ان پر اکثریت حاصل ہے علاوہ ازیں مرد رشتہ داروں، بچوں، صحت اور سماجی زندگی کے بارے میں بھی عورتوں سے زیادہ شاکی ہے۔ لیکن ان کے علاوہ باقی تمام موضوعات پر عورتوں کی اکثریت حاصل ہے۔ یہ امر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ مردوں کے مقابلہ میں پانچ گنا عورتوں کے نزدیک ان کی شادیاں ہر لحاظ سے ناکام ثابت ہوتی ہیں۔ غالباً یقینی طور سے اس نقشہ کی سب سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ ایک درجن عورتوں نے تو خاوند کی محبت میں کمی کی شکایت کی ہے جب کہ اس کے برعکس ایک مرد نے بھی اس کی شکایت نہیں کی۔

—: ۷ :—

مردوں کی مانند بہت سی عورتیں بھی ایک سے زیادہ باتوں کے لیے پریشان تھیں۔ لیکن رقابت کے معاملہ میں عورتوں نے مردوں سے زیادہ تر اختلافی پہلو کا اظہار کیا ہے۔ رقابت کی شکایت کرنے والے تمام مردوں نے طبیعتوں کے اختلافات کا بھی ذکر کیا تھا اور رقابت کی شکایت کرنے والے تین چوتھائی مرد جنسی لحاظ سے بھی ناآسودہ تھے۔ اس کے مقابلہ میں ایسی نصف عورتوں نے اختلاف طبع کا حوالہ دیا اور ان میں سے ایک بھی ناآسودہ نہ تھی۔ اس لیے یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک مرد اپنی بیوی کو بد جنسی ناآسودگی کی وجہ سے) سرد یا مدم کو بھی برتتے محسوس کرتا ہے تو وہ "کسی دوسرے مرد"

کے خدشہ کو زیادہ شدت سے محسوس کرتا ہے جب کہ عورت کو اس وقت کسی حریف عورت کا خیال آتا ہے جب وہ اپنی قیمتی اور اطمینان بخش چیز کو ہاتھ سے جاتے محسوس کرتی ہو۔ جب ایک دوسرے کو جنسی آزادی دینے والے جوڑوں کا مطالعہ کیا گیا تو یہ حقیقت ثابت ہو گئی کہ مرد کے مقابلہ میں عورتیں رقابت کو زیادہ محسوس کرتی ہیں۔ ایسی عورتوں کے خاوند تو ان کی جنسی بے وفائی کو برداشت کر لیتے لیکن عورتیں ذہنی اور نظریاتی طور سے اسے تسلیم کرنے کے باوجود بھی جب حقائق سے دوچار ہوتیں تو چیخ اٹھتیں۔

—: ۸ :—

مردوں کے مقابلہ میں ایسی عورتوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی جنہیں سب سے پہلے اپنے خاوندوں کی خامیوں کا واضح طور سے احساس ہوا تھا۔ صرف آٹھ عورتوں (مردوں کی تعداد تیرہ ہے) میں غیر یقینی کی سی کیفیت پائی گئی۔ یاد رہے کہ غیر مطمئن عورتیں مردوں سے زیادہ بنتی ہیں۔ ایسی عورتوں کی تعداد ۵۳ (مرد ۳۴) بنتی ہے جو بے اطمینانی کے آغاز کی تاریخ بھی بتا سکتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ۲۶ عورتوں کے مقابلہ میں ایسے مرد ۳۱ تھے جنہوں نے ازدواجی زندگی کے پہلے سال ہی میں بے اطمینانی کا اظہار کر دیا تھا۔ آئندہ پانچ سالوں میں ایسے مردوں اور عورتوں کی تعداد میں سوگنا اضافہ ہو گیا جو اپنی شادیوں کو اطمینان بخش نہ سمجھتے تھے البتہ کچھ سالوں میں مردوں نے اپنے آپ کو سنبھالنا شروع کیا۔ جن سات آدمیوں نے صرف سیدھی سادی جسمانی احتیاج کی خاطر شادی کی تھی ان کے دلوں میں منگنی کے دنوں ہی میں ہونے والی بیویوں کے بارے میں شکوک نے سر ابھار لیا تھا۔ اس قسم کی عورت صرف ایک ہی تھی۔ اس کے باوجود بھی انہوں نے شادیاں کیں۔ ایسے مردوں نے شادی کے ابتدائی مہینوں میں اپنی بیویوں کا پہلے سے بھی زیادہ تنقیدی نظر سے جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس کے برعکس شادی کرنے والی عورت اپنے مرد کا تنقیدی جائزہ نہیں لیتی بلکہ محبت کی بھوکی عورت ایک یقینی سی کیفیت میں خود کو پاتی ہے — آنے والے پانچ سالوں میں وہ "جاننا" اور "محسوس" کرنا سیکھتے ہیں اور اتنا طویل عرصہ گزارنے کے بعد کہیں جا کر وہ اپنی قوت فیصلہ کو "جذبات" سے جدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں — عورتوں کی کثیر تعداد پر یہ صادق آتا ہے۔

—: ۹ :—

سوالنامہ میں تین ایسے سوالات تھے جن کے جوابات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شادیوں کو ناکام سمجھنے کے باوجود بھی عموماً لوگ اس جوئے کو اتار پھینکنا ناپسند کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ان لوگوں سے یہ پوچھا گیا کہ کیا وہ محبت کی خاطر اپنے خاوندوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کو تیار ہیں۔ جن عورتوں نے اپنی شادیوں کے بارے میں شدید بے اطمینانی کا اظہار کیا تھا ان سب نے ہی خاوند کی محبت کے باعث اس سے علیحدگی کو ناپسند کیا تھا۔ ان عورتوں سے زیادہ تین مردوں نے بھی یہی جواب دیا۔ دس عورتوں اور گیارہ مردوں نے اسی وجہ سے شادی ختم کرنے سے انکار کیا کہ طلاق یا علیحدگی ان کے اصولوں کے خلاف تھی۔ دس مرد اور اتنی ہی عورتوں نے — ان میں بہت سے طلاق کے خلاف تھے۔ اسی وجہ سے جدائی کو ناپسند کیا کہ اس سے ان کے کاروبار یا سماجی حیثیت کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ ستر مردوں کے مقابلہ میں چھپن عورتوں نے اپنے رفیق حیات کی دل شکنی اور آزردگی کے مدنظر علیحدگی سے گریز کیا۔ صرف بچوں کی خاطر شادی کو گوارا کرنے والی عورتیں ۵۳ (مرد ۶۲) تھیں۔ مردوں کے مقابلہ میں ایسی عورتوں کی تعداد کہیں زیادہ بنتی تھی۔ جو محبت، بچوں یا وفاداری کے احساسات کو پس پشت ڈال کر علیحدگی کی خواہاں تھیں۔ اس کے بعد بڑا دلچسپ اور عجیب سا سوال تھا۔ "فرض کریں کہ بجلی کا بٹن دبانے سے

یہ معجزہ رونما ہو سکتا ہے کہ آپ کی سرے سے کبھی شادی ہوئی ہی نہ تھی — کیا آپ بٹن دبا دیں گی ؟" جب یہ سوال بولا گیا تو ایک مرد نے (جس نے ابھی ابھی ڈیسک کا بلب روشن کیا تھا) فوراً بلب بجھا دیا۔ اس کے دیگر سولہ ساتھیوں نے زبان سے اس کی تقلید کی۔ ایسی عورتوں کی تعداد بھی سولہ ہی بنتی ہے ۔ اگلا سوال یہ تھا کہ کیا ان تمام شکایات اور تلخیوں کے باوجود غیر شادی شدہ ہونے کی صورت میں دوبارہ شادی کی جائے گی ؟ آٹھ عورتوں اور نو مردوں کا جواب نفی میں تھا ۔

چھ اہم سوالات کے جوابات اعدادی نقشہ کی صورت میں درج ذیل ہیں ۔

۱۶ مرد اور ۵۷ عورتیں اپنی شادی میں کوئی نہ کوئی "خصوصی ناقابل اطمینان" چیز پاتی تھیں ۔

۳۴ مرد اور ۵۶ عورتیں "مشکلات کے باعث" سے واقف تھیں ۔ ۷۷ مرد اور ۹۷ عورتیں کوئی ایسی چیز پاتی تھیں جو "چڑنے اور بے اطمینانی" کا باعث بنتی تھی ۔

۳۲ مرد اور ۲۷ عورتوں کو اپنے خاوندوں سے اتنی محبت نہ تھی کہ وہ ان کے ساتھ تمام عمر گزار سکیں ۔

۴۳ مرد اور ۶۳ عورتوں نے یہ کہا کہ اگر بٹن دبانے سے ان کی شادی ختم ہو سکے تو وہ اس کے لیے آمادہ ہیں ۔

۷۳ مرد ۲۵ عورتوں کے خیال میں ان کی ازدواجی زندگی ناکام تھی ۔

ازدواجی زندگی کی ناکامی کے بارے میں عورتوں نے جس قنوطیت کا مظاہرہ کیا وہ یقینی طور سے حیران کن ہے کیا یہ نسائی یاس پسندی ہے ؟ یا یہ ان کی جذباتیت ہے جو انہیں غم کے اندھیروں کی طرف دھکیل رہی ہے ؟ کہیں مردوں نے تو ضرورت سے زیادہ رجائیت اور جانبازانہ انداز کا اظہار نہیں کیا ؟

میرے خیال میں مرد ان ہی خطوط پر چل رہے تھے جن کی تشکیل بچپن میں ہو گئی تھی۔ جب وہ اپنے بچپن کی دیوی کی جگہ لینے والی عورت کا جائزہ لیتے ہیں تو جیسے ان کے کانوں میں کوئی سرگوشی کرتا ہے ۔

"میرے بچے ! یہ تمہاری ماں ہے !" اسی لیے یہ اپنی شادیوں کو ناکام نہ کہہ سکے کیونکہ وفاداری اور جانبازی کے ساتھ ساتھ کمزور اور دوسرے پر انحصار رکھنے والوں کے لیے ہمدردی اور ترس کی وجہ سے ان میں جذباتی رجائیت پیدا ہو گئی ۔

لیکن عورتوں نے اس ضمن میں ٹھوس حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ۔

چار سوالات کے لاکھوں الفاظ پر مشتمل بے تکلفانہ جوابات اور نجی قسم کی تفصیلات کے تجزیاتی مطالعے سے اب یہ پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۵ مرد اور ۵۴ عورتیں مسرور اور مطمئن ازدواجی زندگی گزار رہی ہیں ۔ قطع نظر اس سے کہ یہ لوگ اپنے بارے میں خود کیا رائے رکھتے ہیں۔ لیکن اگر رجائیت پسند مردوں کے خالی دعووں کو لیا جائے تو ۲۷ مرد اپنی شادی کی ناکامی کو تسلیم کرنے سے انکار کریں گے۔ ان میں سے ۱۲ ایسے ہیں جن کے پاس سرے سے کوئی جواز ہی نہیں ۔ اس کے برعکس ۵۸ عورتوں نے شادی کے روشن پہلوؤں کو سامنے رکھا۔ صرف ۳ از اندازہ ضرورت ہیں ۔ عورتیں حقائق کی نسبت جذبات و ہیجانات کے سہارے زندگی بسر کرتی ہیں اور عموماً صحیح گزار جاتی ہیں ۔ ہو سکتا ہے آپ کے ذہن میں یہ بات ہو کہ یہ تمام شادی شدہ جوڑے نہ تھے اس لیے نتائج کا تناسب بعید از توقعات ہے تو آئیے ہم ان ۵۵ جوڑوں کے سوالناموں کا مطالعہ کریں جو اس تحقیقات میں شامل تھے ۔

ان میں سے پچیس جوڑوں کو یکساں قسم کی آسودگی اور اطمینان حاصل تھا۔ دس جوڑے ایسے تھے جن میں بیوی کی نسبت خاوند زیادہ غیر مطمئن تھے۔ جب کہ اس کے برعکس باقی بیس میں مردوں کے مقابلہ میں عورتیں زیادہ غیر مطمئن تھیں حالانکہ ان مردوں اور عورتوں نے بھی دیگر ۲۰۰ کی مانند اپنی اپنی شادیوں کو کامیاب اور مسرور گنوایا تھا ۔

-:۱۰:-

ان سو عورتوں کی ازدواجی زندگیوں کے اس تجزیاتی مطالعہ سے تین اہم نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ گو ایسا کہنا جرأت مندانہ ہی سہی لیکن پھر بھی یہ پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ مہذب اور ذہین عورتوں کی اکثریت پر یہ نتائج منطبق کیے جا سکتے ہیں ۔

ان کی ازدواجی الجھنوں میں سب سے نمایاں اور ممتاز حیثیت جنسی تعلقات کو حاصل ہے ۔ اگر ہم ایک اور کا بھی اضافہ کرنا چاہیں جو ہمیشہ شکایت کا باعث بنتی رہتی ہیں تو یہ ہے — اقتصادی پریشانی ! اب یہ اور بات ہے کہ بے اطمینانی کا باعث کوئی اور ہی وجہ ہو ۔ لیکن اقتصادی پریشانی بہانہ بنا لی جاتی ۔ اقتصادی پریشانی کے ضمن میں جسمانی اور مادی تکلیفوں کو گنا جا سکتا ہے ۔

اگر ہم ان عورتوں کی نفسیات کے اہم ترین پہلو کی طرف اشارہ کرنا چاہیں تو وہ ان کی شدید قسم کی حساسیت ہے ۔ حد سے بڑھی ہوئی ایسی حساسیت جس سے مرد عاری ہوتے ہیں ۔ ان میں بہت سی ایسی ہیں جو اپنی شادی میں سب طرح کی خرابیاں دیکھتی ہیں۔ ان کی بے اطمینانیاں اور شکایات کی فہرست طویل ہے اور اس ضمن میں یہ ہر طرح کی تفصیلات گنوا سکتی ہیں ۔ ان کے فیصلے انتہا پسندانہ ہوتے ہیں ۔ گو مردوں کے مقابلہ میں زیادہ عورتوں نے ایک ہی شکایت گنوائی ہے لیکن اس کے باوجود جب یہ اپنے خاوند پر نکتہ چینی کرنے لگیں تو انہوں نے درجنوں باتیں گنوا ڈالیں ۔ گو مردوں کے برعکس عورتوں کی زیادہ تعداد نے جنسی معاملات پر بے اطمینانی کا اظہار کیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے نازک اور پیچیدہ شعور اس خالص جسمانی معاملہ کے بارے میں کوئی نہ کوئی متبادل ڈھونڈ لیتے جو ان کی مخصوص شکایات کا ازالہ کر سکیں ۔ لیکن اس تمام حساسیت کے باوجود انہیں روحانی اقدار کا کوئی احساس نہیں بلکہ یہ مادی اور جسمانی شکایات میں الجھی ہیں — اور اس معاملہ میں بھی انہیں مردوں پر سبقت حاصل ہے ۔ جہاں تک ازدواجی زندگی کی ناکامی کو تسلیم کرنے کا تعلق ہے تو انہوں نے مردوں کی اکثریت کی طرح جذباتیت پر مبنی رجائیت سے کام لیتے ہوئے حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے ۔ ڈیوڈ ٹی ڈیبر برملے / فلورنس بکیٹس برٹن

نوجوانوں کی جنسی مہمات

نصف صدی قبل کے ادب اور تھیٹر میں پیشہ ور عاشق کا ایک مخصوص کردار ملتا ہے۔ چیک دار سوٹ اور بل کھائی ہوئی مونچھوں والا یہ مرد نوجوان لڑکیوں کا تحقیر آمیز انداز سے مذاق اڑاتے ہوئے انہیں ورغلانے کے لیے طرح طرح کے دام بچھاتا۔ لیکن اب جدید حقیقت پسندی اور جنس و اخلاق کے بارے میں آزادانہ تبادلۂ خیالات نے ایسے کردار کو بیکار بنا کر بعض دیگر ڈرامائی کرداروں کے ساتھ ہی طاقِ نسیاں پر سجا رکھا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر یہ کردار ڈرامائی ادب سے غائب ہو گیا تو افراد میں سے وہ بنیادی چیز بھی ختم ہو گئی ہے جس کی نمائندگی یہ ڈراموں میں کیا کرتا تھا ۔ دراصل وہ ایک مخصوص قسم کے مرد یعنی شکاری مرد کا خاکہ تھا۔ جب ہم نے کالج میں تعلیم حاصل کرنے والے ایسے مردوں کا جائزہ لیا تو ان میں سے نصف ایسے نکلے جن میں شکار کی جبلت میں معروضی انداز کی تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں ۔

کالج کے ۷۳۰ مرد طالب علموں نے ہمارے سوالناموں اور انٹرویو میں استفسارات کے جو جو جوابات دیئے ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انہوں نے چار چار لڑکیوں کے

ساتھ جنسی تعلقات قائم کیے۔ اعتدال پسندوں کی تعداد ۳/۵ بنتی ہے (یہ اوسط سے کم ہے) انہوں نے ایک سے چار لڑکیوں سے جنسی تعلقات استوار کیے۔ اس کے بعد "آتشیں خون والے" نوجوان آتے ہیں ان کی تعداد ۶/۵ ہے (جو کہ اوسط سے زیادہ ہے) ان نوجوانوں نے پانچ سے پچاس لڑکیوں تک سے جنسی اختلاط کا دعوےٰ کیا ہو سکتا ہے ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوں جو اس سلسلہ میں جنسی انتخاب کو بھی مدِنظر رکھتے ہوں یا اب اسے مدِنظر رکھنا شروع کر دیا ہو۔ لیکن ہم نے ان نوجوانوں کو آتشیں خون والے قرار دیا ہے۔ جنہوں نے بیس سال کی اوسط عمر میں پانچ یا پانچ سے زیادہ لڑکیوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کیے۔ ان کی طبائع کے انفرادی تغیرات بھی پیشِ نگاہ رکھے گئے ہیں۔

سترہ ایسے مرد تھے جنہوں نے اپنی لڑکیوں کی تعداد صحیح صحیح نہ بتائی بلکہ کچھ اس طرح کے جوابات دیئے "لاتعداد"۔۔۔ "بہت زیادہ"۔۔۔ "کبھی ان کی گنتی نہ کی تھی" ان سب کو یاد نہیں رکھ سکتا"۔ اس سلسلہ میں سرفہرست ایک درجن ایسے مرد ہیں جنہوں نے بیس سے پچاس لڑکیوں کا دعوےٰ کیا۔ ہو سکتا ہے بعض نے مبالغہ بھی کیا ہو اور اس قماش کے مردوں سے کچھ بھی بعید نہ ہوگا۔ اور یوں بھی ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی اس لیے کالج کے طالب علموں کی جنسی زندگی کی مجموعی تصویر ہمارے سامنے آئی ہے ان کے مبالغہ سے اس کے اصل نقوش میں کچھ ایسا فرق نہیں پڑ سکتا۔

آتشیں خون والے بیشتر عاشق اکثر معاملات میں دوسرے گروہوں سے ملتے جلتے تھے اور ملبوسات، کھیلوں اور فرصت کے اشتغال وغیرہ کے انتخاب میں یہ بھی دوسروں کی طرح مروّجہ فیشنوں سے متاثر ہوتے تھے۔ یہ ملک کے کسی مخصوص علاقہ کے باشندے نہ تھے۔ ان میں سے اکثریت کا تعلق متوسط طبقہ کے گھرانوں سے تھا۔ انہوں نے بے شک سکولوں میں تعلیم پائی تھی اور اپنے والدین کی ازدواجی زندگی کو کامیاب اور مسرور سمجھتے تھے لیکن ــــ اور یہ بڑا دلچسپ استثنا ہے ــــ صرف پندرہ فیصد کے والدین ایسے تھے جو انسانی کردار کو مذہبی معیار پر پرکھتے تھے۔ گویا تمام گروہوں کے مقابلہ میں مذہبی والدین کے لحاظ سے ان کا تناسب سب سے کم تھا۔ وہ لوگ جو خالص کنوارے تھے یہ بلحاظِ تناسب اس کے نصف سے بھی کم تھے۔ ان کی جنسی زندگی کے جائزہ سے ایک مروّجہ خیال کی تردید ہوتی ہے یعنی بیشتر عاشق عموماً ایک شہری مرد ہوتا ہے جو گاؤں کی بھولی بھالی لڑکیوں کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے دمِ تزویر میں پھانس کر نشانۂ ہوس بناتا ہے۔ لیکن ان لڑکوں کے کارناموں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اب بھی دیہی لڑکیاں آسانی سے قابو میں آجاتی ہیں لیکن انہیں پھانسنے والے شہری نہیں بلکہ دیہی مرد ہوتے ہیں۔ ایسے دیہات میں جن کی آبادی ایک سے پانچ ہزار نفوس پر مشتمل تھی، ان نوجوان لڑکوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی جنہوں نے کالج سے قبل ہی جنسی اختلاط کا مزا چکھ لیا تھا ان کا تناسب سینتیس فی صد جب کہ تمام گروہ کا مجموعی تناسب اکتیس فیصد ہوتا ہے۔

اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ گاؤں کے خشک اور بے کیف ماحول میں نہ تو کسی قسم کی دلچسپی ہوتی ہے اور نہ ہی فرصت کے اوقات گزارنے کے لیے موزوں سہولتیں ملتی ہیں۔ شہر خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے وہاں اب نوجوانوں کے لیے کئی طرح کی دلچسپیاں مثلاً ورزش گاہیں، تالاب، کھیل کے میدان اور کلبیں وغیرہ ملتی ہیں اور غالباً ایک گاؤں ہی ایسی جگہ ہے جو یہاں نوجوانوں کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ اوقاتِ فرصت گزارنے کے لیے ان نوجوانوں کو کس طرح کی دلچسپی کا سامان نظر نہیں آتا اس لیے بعد میں وہ عنفوانِ شباب کے جبلی تقاضوں کی تکمیل کی صورت میں سامانِ دلچسپی بہم پہنچا لیتے ہیں۔

دیگر نوجوانوں اور ان آتشیں خون والے نوجوانوں میں گو بعض اختلافات اور امتیازات ملتے ہیں۔ لیکن وہ اس قابل نہیں کہ انہیں نظرانداز کیا جا سکے۔ یہ اختلافات و امتیازات کالج سے قبل کی زندگی کے گرد گردش کناں تھے اور انہوں نے کالج میں آکر جیسی زندگی گزارنی تھی اس کے ابتدائی نقوش ہائی سکول سے ہی واضح ہو چکے تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سو فیصد میں کالج آنے کے بعد سرے سے کسی قسم کی تبدیلی ہی نہ پیدا ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ کالج کے نوجوان اچھے خاصے سیماب صفت ہوتے ہیں۔ اور ہر طرح سے اثر پذیری کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ بعض ایسے نوجوان جو پہلے بھنورا بنے کلی کلی اور پھول پھول کا منہ چومتے تھے اب ایک دم سے اعتدال پسندی کی روش اپنا لیتے ہیں۔ بعض گرفتارِ الفت ہوئے جب کہ بعض کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب انہیں کوئی بیماری آ لگی۔ اب آیا کہ وہ ہمیشہ ایسے ہی رہتے ہیں یا پھر اپنی ابتدائی زندگی اپنا لیتے ہیں۔ تو اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ ہمارا جائزہ وقت کی قیود سے آزاد ہے۔

ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آتشیں خون والے مدارجِ تہذیب سے نسبتاً کم متاثر ہوئے ہیں۔ اعتدال پسندوں اور خالص کنواروں کے گروہ سے تعلق رکھنے والوں نے ہمارے اس جائزہ میں کافی سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے ہمارے استفسارات کے حسن و قبح کا جائزہ لیتے ہوئے ان پر ہر طرح سے اپنے خیالات کا اظہار کیا جب کہ اس کے برعکس آتشیں خون والوں کو صرف اپنے کارناموں سے ہی غرض تھی اس مضمون میں ان لوگوں کی گفتگو کے جو جو حوالے اور اقتباسات دیئے گئے ہیں ان کے انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ یہ دوسروں کی نسبت زیادہ جامع ہونے کے ساتھ ساتھ اس مسئلہ پر زیادہ واضح طور سے روشنی ڈالتے ہیں۔

ان میں اثر پذیری کی صلاحیت بہت زیادہ ہوتی ہے اور مجموعی لحاظ سے یہ سبھی اس نظریہ کے حامل تھے کہ ضبطِ نفس ناممکن العمل یا ایک احمقانہ خیال ہے۔ ان کے نزدیک ضبطِ نفس ناقابلِ برداشت بوجھ ہے انہوں نے بے تکلفانہ سادگی کے ساتھ یوں لکھا: "اسے کبھی آزمایا ہی نہیں" جب ان کے سامنے جنسی کردار کے بارے میں ایک مخصوص معیار کا مسئلہ رکھا گیا تو ان میں سے بعض نے اس پر حیرت کا اظہار کیا کہ ان کے بقول "ہاں" کرنے والی لڑکی کی موجودگی میں خود پر احتساب کے پہرے عائد کر کے ترسنے کی بھلا کیا تک ہے؟ ایک بائیس سالہ مرد نے جس کے تعلقات ۳۵ لڑکیوں کے ساتھ ایسے تھے، یوں لکھا: "میں جنسی اختلاط کرنے پر اس وجہ سے مجبور ہوں کہ اب یہ ایک عادت کی صورت اختیار کر چکا ہے"۔ ایک دوسرے نے لکھا: "جو مرد اپنے بارے میں ہر طرح کی احتیاط کر سکتا ہو تو میرے خیال میں جنسی اختلاط نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔"

قبل از وقت جنسی بیداری

گو یہ ذہنی لحاظ سے اتنے پختہ نہیں پائے گئے لیکن آتشیں خون والے اپنے دیگر ہم عمروں کے مقابلہ میں مردانگی کے حقوق اور آزادی سے متمتع ہونے کے لیے زیادہ جلدبازی کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ جذباتی اور خوش فکرے نوجوان اپنی طبیعت کی طرح جنسی کردار کے معاملہ میں بھی بے خوف اور بے جھجک ثابت ہوتے ہیں۔ یہ ان نوجوانوں کے بالکل برعکس ہیں۔ جنہوں نے خود کو کنواری لڑکیوں کی طرح سے بچا بچا کر رکھا ہوتا ہے۔ یہ ابھی عنفوانِ شباب تک پہنچے بھی نہ تھے کہ ان کی زندگیوں میں لڑکیوں کو خاصی اہمیت ہو گئی۔ خالص کنواروں میں ایسے نوجوان نصف سے زیادہ ملتے ہیں جنہوں نے ہائی سکول یا کالج

میں کس لڑکی سے "ڈیٹ" نہ کی تھی لیکن ان آتشیں خون والوں کی تیزی ملاحظہ ہو کہ ان میں سے تین چوتھائی ہائی سکول ہی میں ڈیٹ کے مرحلہ سے گذر کر زیادہ گرمجوشی اختیار کر چکی تھی۔

اس جائزہ کے سب سے حیران کن اعداد اس کم عمری کو ظاہر کرتے ہیں جس میں ان کے الٹے سیدھے جنسی تجربات کا آغاز ہو چکا تھا ان ۷۰ ۳ طلباء میں سے دو تہائی ایسے مردوں کی تھی جن کا اوّلین جنسی تجربہ ہائی سکول کے زمانہ میں ہوا۔

آتشیں خون والے اس ضمن میں انتہائی صورت اختیار کیے ہوئے ملتے ہیں چنانچہ اکثر نے یہ بتایا کہ انہوں نے دس سال کی عمر سے بھی پہلے جنسی اختلاط کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب کہ دوسروں نے اپنی جنسی مہمات کا آغاز بارہ یا چودہ سال کی عمر میں عنوانِ شباب پر کیا۔ ان سے نصف ایسے تھے جنہوں نے اوّلین جنسی اختلاط سولہ یا اس سے بھی قبل کی عمر میں کیا تھا۔ اس کے مقابلہ میں اعتدال پسندوں میں سے صرف ۱۵ فیصد ایسے نکلے جنہوں نے سولہ سال کی عمر میں جنسی زندگی کا اوّلین سبق سیکھا۔ اس گروہ کے نصف مردوں نے اوّلین جنسی اختلاط اپنے ہی طبقہ کی لڑکی کے ساتھ کیا جب کہ ابتدائی تجربہ کے لیے ایک تہائی نے طوائفوں کی طرف رجوع کیا تھا تقریباً ۱۵ فیصد جنسی زندگی کی ابجد سے واقفیت کے لیے اپنے سے زیادہ عمر کی عورتوں کے مرہونِ منت تھے۔

قبل از وقت بلوغ اور ہرجائی پن میں جام دینا ایسا ساتھ ملتا ہے چنانچہ اس گروہ میں سے جن تین چوتھائی نے چودہ یا اس سے بھی کم عمری میں جنسی زندگی کا آغاز کیا تھا یہ سبھی آتشیں خون والے تھے۔ اسی طرح جن ایک درجن افراد نے بیس سے پچاس لڑکیوں سے جنسی تعلقات کا دعوٰے کیا تھا ان میں سے بھی بہت سے ایسے ملے تھے جنہوں نے قبل از وقت جنسی پختگی حاصل کر لی تھی۔

پہلی ملاقات پر:

اس طرح کے تقریباً سبھی نوجوان شدید جذباتی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کورٹ شپ کے اس طریقہ میں ماہر ہوتے ہیں جسے اس کی طوفانی نوعیت کی وجہ سے "گرداب اور بگولہ" سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ وہ مرد جن کی جنسی زندگی کا آغاز طوائفوں سے ہوتا تھا ان میں سے دس فیصد ایسے تھے جو اوّلین جنسی رفیق کو سات دن سے بھی کم عرصہ سے جانتے تھے۔ اس میں مرد کی تیز رفتاری کی انتہائی مثال اس واقعہ سے ملتی ہے جس میں پہلی ملاقات کے تیس منٹ بعد ہی معاملہ پٹ گیا تھا جب کہ بعض معاملات چند گھنٹوں کے بعد طے پا گئے۔ کئی ایسے لڑکے بھی تھے جنہوں نے اپنے طبقہ کی لڑکی کے ساتھ ملاقات والے دن یا شام ہی کو جنسی فعل کر لیا تھا۔

مندرجہ بالا حقائق سے یہ امکان بھی واضح ہوتا ہے کہ بعض مرد ایسے بھی ہیں جن کے لیے عرصۂ ملاقات کا اختصار ایک ناگزیر کشش کا حامل ہے۔ سترہ سال کے جس لڑکے نے اپنی زندگی کی پہلی لڑکی کو تیس منٹ میں تسخیر کیا تھا وہ اس عجیب لڑکی میں اس لیے بھی زیادہ کشش محسوس کرتا تھا کہ وہ لڑکی اس کے بچپن اور ماضی سے متعلق نہ تھی۔ گویا لڑکی نے اس کی پرقوت مردانگی کی وجہ سے اتنے قلیل عرصہ میں اپنا جسم اس کے حوالہ کر دیا وہ اپنی مردانگی کو یوں دریافت کر رہا تھا!

یہ ایک خصوصیت قابلِ ذکر ہے کہ مردوں اور عورتوں نے اس حقیقت کی نقاب کشائی میں کافی جھجک کا ثبوت دیا کہ فریق ثانی نے ان تعلقات کو ختم کرنے میں پہل کی۔ آتشیں خون والوں کے تمام جنسی معاملات میں سے تقریباً ایک تہائی کا خاتمہ محض دوری کی وجہ سے ہوا۔ اس قسم کے معاملات میں وہ بھی شامل ہیں جو چھٹیوں میں اتفاقیہ ملاقات کسی کے گھر یا پارٹیوں کے مواقع پر طے پائے۔ جہاں تک باقیوں کا تعلق ہے تو ان آتشیں خون والوں نے اپنی ذات تک سے بھی اس حقیقت کا اعتراف نہ کیا کہ خود لڑکی ہی کا دل ان سے بھر گیا اور اس نے یہ قصہ ختم کر دیا۔ جیسا کہ ایک نوجوان نے لاشعوری طور پر مزاحیہ انداز سے یوں کہا "وہ کسی اور لڑکے کے پیچھے پڑی تھی اور میں اس لڑکے کے راستے کا روڑا نہ بنا"۔

تعلقات ختم کرنے کے لیے جو جو وجوہات بیان کی گئی ہیں وہ خالی از اہمیت نہیں۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ ایک ایک فقرہ اپنے دامن میں افسانوں کے کئی کئی پلاٹ رکھتا ہے سب سے عام قسم کی وجہ کچھ اسی طرح کی تھی۔ "میں اس سے اکتا چکا تھا"۔ بعض انفرادی وجوہات بھی سن لیجئے۔ "وہ ضرورت سے زیادہ گھریلو تھی"۔ "میں نے اس کی شادی کے بعد تعلقات ختم کر لیے"۔ "اس نے اپنا بچہ ضائع کرا دیا تھا" اور ایک مثال ایسی بھی ہے جس میں لڑکے نے مزید تفصیلات میں جائے بغیر صرف یہ بتایا "اس کے بچہ ہو گیا"

حسِ لطیف سے عاری نوجوان

نوجوان اور خصوصیت سے نوجوان مرد بہت زیادہ سخت گیر ثابت ہو سکتا ہے اس کی ناعاقبت اندیشی کے علاوہ نوجوانی کی پیدا کردہ وہ انا بھی اس سخت گیری کی وجہ ہو سکتی ہے جو ہر طرح سے حصول توجہ چاہتی ہے۔ چنانچہ آتشیں خون والوں کی کثیر تعداد محض ان جابر اور پرشہوت افراد پر مشتمل تھی۔ جن کے لیے بہیمانہ انداز میں جنس محض جنس تھی اور وہ اس ضمن میں کسی قسم کی نازکی اور لطافت کا سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ دیگر گروہوں کی نسبت خصوصیت سے ان میں جبلت کے زیر اثر جنسی تحریک بیدار ہوتی تھی۔ ایک طالب علم نے بتایا کہ طوائفوں کے پاس جانے کا سب سے بڑا نقصان ہی یہ ہے کہ وہاں مرد کے "جذبہ تسخیر کی آسودگی" نہیں ہوتی۔ ایک دوسرے نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہ وہ کس قسم کی لڑکی کے ساتھ "ڈیٹ" کرنا پسند کریگا۔ یہ لکھا: "وہ ایسی ہو بالکل جسے آسانی سے حاصل نہ کیا جا سکے۔ لیکن ہو قابلِ حصول"۔ اس قسم کے مردوں کو اگر اپنے طبقہ میں سے کوئی خوبصورت اور پرکشش لڑکی نہ ملے تو یہ طوائفوں کے پاس جانے سے دریغ نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنی داستانیں قطعی غیر لطیف انداز سے بیان کیں جن کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ لڑکے کو لڑکی کی احتیاج ہے۔ لڑکے کو لڑکی ملتی ہے۔ لڑکا لڑکی کو حاصل کر لیتا ہے۔

ایک اکیس سالہ مرد نے جو ایک بڑے دارالحکومت کی یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا اپنے اس اوّلیں جنسی تجربہ کے بارے میں بتایا جو اس نے سترہ سال کی عمر میں اپنے طبقہ کی ایک لڑکی کے ساتھ کیا۔ ایک شام جب کہ لڑکی کے گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے تو اس نے لڑکی سے اس کی خواب گاہ میں جنسی اختلاط کیا اس نے بتایا کہ وہ ایک سال کی مسلسل کوششوں کے بعد اس لڑکی کو تسخیر کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ عموماً اتنی دیر نہیں لگتی ہے لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ بقول اس کے "وہ ایک اونچی قسم کی لڑکی تھی .... اعلیٰ خاندان .... میں تقریباً تین ماہ سے اس کے ساتھ لگا ہوا اسے جنسی فعل کے لیے آمادہ کرتا رہا تھا"۔ ایک اور مرد نے ایک "اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذہین دوشیزہ کے بارے میں یوں لکھا: "میں نے اس کے جسم کو سہلا سہلا کر اسے جنسی فعل کے لیے ہیجانی لحاظ سے بیدار کیا"۔

ایک ساحلی تاجر کے بیٹے نے سترہ سال کی عمر میں پہلی مرتبہ جنسی تجربہ حاصل کیا یہ

ایک شام بھی وہ اپنے سکول کے ڈرامہ کی ریہرسل سے فراغت کے بعد لڑکی کو اپنے باپ کی کار میں اس کے گھر واپس چھوڑنے جا رہا تھا۔ اس کے بقول "وہ بہت اچھی لڑکی تھی" جنسی فعل کی انجام دہی کے بعد "وہ کچھ دیر کے لیے روتی رہی"۔ ان کا یہ سلسلہ ڈیڑھ سال تک چلتا رہا۔ اس کے بعد وہ کالج میں داخلہ لینے کے لیے گھر چھوڑ کر آ گیا۔ اب وہ اپنے ماضی کے اس واقعہ پر بالکل لاتعلقی اور غیر جذباتی طریقہ سے سوچتا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس نے اس لڑکی کو کبھی بھی اہمیت نہ دی تھی۔

غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل

جب ایک مرد ۱۲ سال کا ہو تو اس کے لیے صرف جذباتی بنے ہوئے اپنی الٹی سیدھی خواہشات کی تسکین دہی کافی نہیں ہوتی۔ خالص لاپرواہی "جو ہو سو ہو" کے انداز میں ایک سحور کن کشش ملتی ہے نوجوانوں کی یہ غیر ذمہ داری اور لاپرواہی بڑے بوڑھوں کو زچ کر دیتی ہے لیکن واضح رہے کہ یہ نوجوانی کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ اور نوجوان پوچھتے ہیں کہ ایسا کیوں نہ ہو؟ وہ کیوں دور اندیشی اور احتیاط سے کام لیں۔ ابھی اس کے لیے بہت وقت پڑا ہے! اسی لیے یہ بھی حال کی خوشیوں میں مست عیش و مسرت کی شاہراہ پر آنکھیں بند کیے سرپٹ بھاگے جا رہے ہیں ان کے خیالات کچھ اس طرح کے ہیں: "میں تو ٹک کر گھر بار بنانے کے جھنجھٹ میں پڑنے سے پہلے خوب جی بھر کر من مانی کرنا چاہتا ہوں"۔ "میں کب شادی چاہتا ہوں؟ پہلے مجھے دل کی حسرتیں تو نکال لینے دیجیے"۔ "شادی؟ ہنوز دلی دور است۔ یہ تو مجھے پتہ ہے کہ مجھے شادی کرنا ہے لیکن میں اس وقت شادی کروں گا جب مجھے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ نظر آئے"۔

ان کے اپنے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں کو کبھی بھی اپنے کیے کا بھگتنا نہ پڑا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنی لاپرواہی کو مبالغہ آمیز رنگ میں پیش کر رہے ہیں۔ اور یہ ان کے اندازِ زیست سے جداگانہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ان میں سے ۷۰ فیصد ایسے تھے جنہوں نے ہائی سکول کے دوران ہی میں ضبطِ تولید کے بارے میں معلومات حاصل کر لی تھیں۔ انہوں نے بڑے فخر سے بتایا کہ یہ معلومات "لڑکی کو حمل سے محفوظ رکھنے کے لیے کافی تھیں"۔ "مجھ میں اتنی سمجھ ہے کہ میں ایسے معاملوں میں احتیاط برتتا ہوں" تقریباً ہر ایک نے ہائی سکول کے ان ساتھیوں کے ایسے معاملات گنوائے جو اسقاط یا زبردستی کی شادیوں پر منتج ہوئے۔

آتشیں خون والے جس تیزی سے ایسے معاملات کو طے کرتے تھے اس کا ایک فائدہ معلومات کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے اسقاطِ حمل کے تجربات اعتدال پسندوں سے دو گنے تھے۔ دس فیصد نے اس کا اعتراف کیا کہ انہوں نے ایک یا اس سے زیادہ لڑکیوں کو حاملہ کیا تھا گو لڑکیوں کی اکثریت نے اپریشن کے ذریعہ بچہ ضائع کرایا تھا۔ لیکن بعض صورتوں میں خود مردوں نے بھی اپنی "نیم حکیمی" کے مطابق ان کے لیے الٹی سیدھی دوائیاں تجویز کی تھیں۔

عام لوگوں کے ذہنوں میں افسانوں یا گپ شپ کی وجہ سے یہ خیال جم چکا ہے کہ آج کی نئی نسل جنسی لحاظ سے اچھی خاصی شیطنیت اختیار کر چکی ہے لیکن ہمارے سوالناموں یا انٹرویو کے دوران میں نوجوانوں نے بظاہر جس بے باکی اور آزادی سے ہمارے استفسارات کے جوابات دیئے اس سے ایسی جنسی مہمات کے بارے میں کچھ نہ پتہ چلا جن سے عوامی نظریہ کی توثیق ہوتی اور تو اور "اجتماعی عیاشی" کی بھی برائے نام مثالیں ملیں۔ ایک انیس سالہ لڑکے نے (جس کا باپ ایک مستری تھا) ایک ایسی لڑکی کے بارے میں مبہم انداز سے لکھا۔ جس کے ساتھ تین چار مردوں نے جنسی اختلاط کیا اور جس کے نتیجہ میں وہ بیمار پڑ گئی۔ بعض نے اپنے اوّلیں جنسی تجربہ کو "نیم اجتماعی" بتایا۔ ایک مثال ہائی سکول اور دوسری شرابیوں کی ایک پارٹی کی تھی۔ ایک طالب علم نے ہائی سکول کے طلباء کی ایک ایسی اجتماعی عیاشی کی داستان سنائی۔ جو ایک سکینڈل کی صورت اختیار کر گئی لیکن یہ معاملہ یوں دبا دیا گیا کہ شہر کے کئی ممتاز گھرانوں کی عزت خطرہ میں پڑتی تھی۔

شراب اور جنس

ہمارے اس جائزہ سے جہاں شہری اور دیہی لڑکیوں میں اختلافِ طبع کے مروجہ عقیدہ کی تردید ہوئی ہے وہاں شراب اور جنس کے باہمی رشتہ کے بارے میں جو قدیم نظریہ چلا آتا ہے اس کی توثیق بھی ہوتی ہے۔ جنسی لحاظ سے ناتجربہ کار ۱۵ فیصد لڑکوں نے ہائی سکول میں شراب نوشی شروع کر دی تھی جب کہ ان کے مقابلہ میں آتشیں خون والوں میں سے نصف سے زائد نے اس عمر میں شراب نوشی کی عادت اختیار کر لی تھی کالج پہنچتے تک شراب نوشوں کا تناسب ۹۰ فیصد تک جا پہنچتا ہے جب کہ اوّل الذکر کی تعداد ۵۰ فیصد رہ جاتی ہے۔

تمام مردوں نے یہ نہ تسلیم کیا کہ ان کے معاملہ میں شراب ایک طرح سے مہمیز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اکثر نے اس سے انکار کیا یا اس کے اثرات کو چنداں اہمیت نہ دی۔ ایک بہت ہی ہرجائی مرد نے لکھا "کبھی کبھار شراب نوشی کے بعد ہی ایسی لڑکی کے ساتھ بھی سو رہا ہوں جسے عام حالت میں شائد میں قبول نہ کرتا۔ لیکن مجھے ایسا کوئی معاملہ یاد نہیں جو اس شام یا ہفتے کے اختتام سے زیادہ چلا ہو"۔

ہمارے مطالعہ کے عمومی نتائج اس حالیہ جائزہ کے ساتھ منطبق ہو جاتے ہیں جس میں نیویارک سٹیٹ میں رہنے والے ۱۸ سے ۲۵ سال کی عمر کے مردوں اور عورتوں کی شراب نوشی کی عادات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ جائزہ نیویارک یونیورسٹی کے ڈاکٹر پال سٹوڈینسکی نے مسز جان ایس شیپرڈ (صدر، نیشنل کانفرنس آف سٹیٹ لیکر ایڈمنسٹریشن) کی زیرِ نگرانی لیا تھا۔ اس میں دو ہزار سے زیادہ سوالناموں سے کام لیا گیا۔ جواب دینے والوں میں سے اکثریت نیویارک کے نوجوان مردوں اور عورتوں پر مشتمل تھی۔ اس جائزہ میں شراب نوشوں کی تعداد ۸۷ فیصد بتائی گئی ہے جو کہ زیرِ نظر مطالعہ کے جنسی تجربہ کاروں کی ۸۵ فیصد کے ساتھ ملتی ہے لیکن اس جائزہ کے اعداد و شمار ہمارے تمام گروہ کے مجموعی تناسب یعنی ۷۸ فیصد سے نہیں ملتے ہیں۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر موصوف کے طلباء کی اکثریت زیادہ تر دارالحکومت کے کالجوں سے تعلق رکھتی ہے اس لیے دونوں صنفوں میں لازماً شرابیوں کی کثرت ہوگی۔ جب کہ ہم نے جن طلباء کا مطالعہ کیا وہ ملک کے تمام طبقات اور علاقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

جنس اور شراب کے باہمی تعلق کے بارے میں ہمارے طلباء کی مانند ڈاکٹر سٹوڈنسکی کے جائزہ والے مردوں کی آراء میں بھی اختلافات پائے جاتے تھے۔ اٹھارہ سے اکیس سال عمر کے نوجوان طلباء کی معمولی سی اکثریت نے شراب اور جنس کے باہمی تعلق کو تسلیم نہ کیا۔ اکیس سے پچیس سال کے درمیان والی عمر کے طلباء کے خیال میں شراب کے باعث انسان خود پر ضبط نہیں کر سکتا۔ شراب نوشی سے پرہیز کرنے والے طلباء کی خاصی اکثریت کا یہ عقیدہ تھا کہ دوسرے لوگ جنسی کارگزاریوں کے لیے شراب کو بطور مہمیز استعمال کرتے ہیں۔

ہمارے مطالعہ کے مردوں کی اکثریت سوالنامہ میں ان سوالات کے جوابات نہ دے سکی جو جنس اور شراب کے باہمی رشتہ کے تعین کے لیے درج کیے گئے تھے جس کا یہ مطلب ہے کہ ابھی تک اس موضوع پر ان کے اپنے خیالات بھی واضح نہیں ہیں ۔ جواب دینے والوں میں سے ۴۰ فیصد کے خیال میں شراب کی "وجہ سے کسی معاملہ نے آغاز نہ پایا تھا" جب کہ ۴۰ فیصد کے معاملات اس کی وجہ سے طے پائے تھے۔ مختلف گروہوں میں اس بارے میں جو تغیرات پائے گئے اس کی بڑی وجہ ان کی جنسی عادات تھیں۔ آتشیں خون والے بھی اس ضمن میں نصف نصف تھے۔ محتاط قسم کے مردوں کی تین چوتھائی نے یہ بتایا کہ ان کی جنسی مہمات شراب کی مرہون منت نہ تھیں۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ جن طلبار نے اپنی جنسی زندگی شراب کے تابع نہ کی ان میں سے بیشتر نے دوسروں کے ضمن میں اس کی اہمیت پر زور دیا۔ آتشیں خون والوں میں سے دو تہائی نے (جن میں سے اکثر خود بھی شراب کے عادی تھے) اپنے احباب کے بارے میں جنسی واقعات کا حوالہ دیا جو شراب کے مرہون منت تھے ۔

دراصل اس معاملہ میں طلباء بھی ایک حد تک بے بس ہوتے ہیں کیونکہ مرد شروع سے اپنی مردانگی کے بارے میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی حساس ہوتا ہے اس لیے وہ ہر اس شے کے خلاف پورے خلوص اور دیانت داری سے سینہ سپر رہتا ہے جو اس کی مردانگی پر حرف لا سکتی ہو۔ انہوں نے اپنے احباب اور ہم جماعتوں کے واقعات سنانے میں کئی مثالوں کا حوالہ دیا۔ ایک سائنس دان کے بیٹے نے حمل گرانے کے پانچ واقعات کے ضمن میں تحریر کیا" ان میں سے چار حمل اس وقت ٹھہرے جب دونوں نشے میں دھت ہونے کی وجہ احتیاطی تدابیر نہ اختیار کر سکے اور جب حقیقت کا علم ہوا تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اگر ایک لڑکی معقول معلومات رکھتی ہو تو وہ حمل کے معاملہ میں محتاط رہ سکتی ہے لیکن اگر شراب سے وہ اپنے ہوش و حواس ہی میں نہیں اسے قطعی نہ چھونا چاہیئے اس وقت یہ کار الفت نہ ہوگا بلکہ اچھا خاصا زنا بالجبر!"

آتشیں خون والوں کی اکثریت اس سلسلے میں ہر طرح کے احساسات سے عاری پائی گئی۔ مخصوص قسم کے خیالات کا نمونہ یوں ہے ۔

"اگر لڑکی شراب سے مدہوش ہو تو بڑی آسانی سے اس کے ساتھ من مانی کی جا سکتی ہے"۔" "انتہائی حدود تک پہنچ جانے والی لڑکیاں عموماً شراب کی رسیا ہوتی ہیں"۔" ہم دونوں ہی نشہ میں مست تھے اور ضبط تولید کے بارے میں کچھ کرنے کا ہوش بھی نہ تھا لیکن خوش قسمتی سے کچھ بھی نہ ہوا"۔" "جب ہوش قدح سے بزم چراغاں ہو تو اس کا مجموعی اثر بڑا خوش ہوتا ہے" بعض استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر یہ نیم وحشیانہ رویہ آتشیں خون والوں کے کردار کی ایک خاص خصوصیت ہے۔ اسے ہم خام کاری اور خود غرضی کا امتزاج قرار دے سکتے ہیں ۔ ان کا مطمع نظر تو یہ ہے ۔

بابر بہ عیش کوشش کہ عالم دوبارہ نیست

اور اس کے علاوہ انہیں اچھے برے انجام سے کوئی غرض نہیں ۔ جہاں تک شراب ان کی عیش کوشی میں ممد ہوتی ہے تو اس کا ان الفاظ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو مدارج نشہ کے اظہار کے لیے عوام نے وضع کر رکھے ہیں ۔ بلندی، تناؤ، دائرے، بدبو سے، بے ہوشی !

راہ چلتی لڑکیاں پھانسنا

راہ چلتی لڑکیاں پھانسنے کے لیے عموماً شراب سے مدد لی جاتی ہے: اگر میں نے شراب نہ پی ہو تو میں راہ چلتی لڑکی کو کبھی بھی نہیں پھانس سکتا"۔" آپ شہر کی لڑکی کو پھانس کر کسی ہوٹل میں لے جا سکتے ہیں لیکن اس کے لیے پینا ضرور ملے ہے"۔

یہ شکاری مرد اپنے شکار کی تلاش میں شہر یا قصبہ کی گلیوں اور سڑکوں کے علاوہ ریستورانوں اور رقص گاہوں کا رخ کرتے ہیں ۔ اگر اپنے طبقہ کی کوئی لڑکی ان کے ہتھے نہ چڑھے تو یہ اجرتی طوائفوں سے بھی کام چلا لیتے ہیں ۔ بعض کالجوں میں ایسی لڑکیوں کو "شہری" (TOWNIES) کہا جاتا ہے۔ یہ لڑکیاں پیشہ ور بھی ہو سکتی ہیں جیسے ہوٹلوں کی خادمائیں ، رقص گاہوں کی میزبانیں ، سٹوروں کی کلرک، محکمہ ٹیلی فون کی ملازمین، حتیٰ کہ مقامی ہسپتال کی نرسیں بھی اس زمرہ میں آجاتی ہیں ۔ بعض اوقات گھریلو لڑکیاں بھی وقت کٹی اور "جذبہ مہم" کی خاطر سڑکوں پر نکل آتی ہیں ۔ کیونکہ یہ تفنن طبع کے لیے ایسا کرتی ہیں اس لیے یہ معاوضہ نہیں قبول کرتیں بلکہ ایک خوشگوار شام، بارات کے کھانے اور سینما (یا اس شہر کی کوئی اور تفریح) کے عوض اپنے آپ کو پیش کر دیتی ہیں اب یہ مرد پر منحصر ہے کہ وہ انہیں کسی آراستہ کمرہ یا کسی ہوٹل میں لے جاتا ہے اگر وہ اپنے گھر والوں سے علیحدہ آزاد زندگی بسر کر رہی ہوں تو وہ اسے اپنے ہی کمرہ میں لے آتی ہیں ۔ عموماً یہ ایک رات کی داستان ہوتی ہے اور اگلی صبح کچھ ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے !

رات کی بات کا مذکور ہی کیا
چھوڑیئے رات گئی بات گئی

آتشیں خون والوں نے ان لڑکیوں کے بارے میں نہ تو خوشگوار لہجہ میں بات کی اور نہ ہی انہیں استعمال کرنے یا انہیں حاملہ کرنے کے امکانات کو روکنے کے لیے کسی طرح کی احتیاط کا ثبوت دیا بلکہ انہوں نے تو ان کا ذکر بھی نفرت اور حقارت سے کیا ہے۔ انہیں ان لڑکیوں میں کسی قسم کی رفاقت نہ ملتی تھی اور وہ شعوری طور سے انہیں جسمانی آسودگی کے لیے استعمال کرتے تھے ۔ خصوصیت سے یہ ان کالجوں کے لڑکوں پر صادق آتا ہے ۔ جہاں مخلوط تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے وہ لوگ ابھی خاصی راہبانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں ۔ دیگر گروہوں کے طلبا نے ایسے تعلیمی ماحول کو چنداں اہمیت نہ دی لیکن آتشیں خون والوں کو اکثر صنف نازک کی محبت میسر نہ آئے تو وہ بے چین ہو کر گھبرا اٹھتے ہیں ۔ ایک ایسے طالب علم نے جس کی جنسی زندگی کا آغاز بارہ برس کی عمر سے ہوتا ہے اور جس کے پندرہ سے پچیس لڑکیوں کے ساتھ تعلقات رہ چکے تھے ۔ اپنے بارے میں یوں بتایا"۔" کچھ عرصہ کے ضبط کے بعد میری یہ حالت ہو جاتی ہے کہ میں کسی لڑکی سے دوستانہ لہجہ اور فطری انداز سے بات تک نہیں کر سکتا"۔

نوجوان مرد اس قسم کی صورت حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کئی طرح کی ترکیبیں کرتے ہیں ان میں سے بعض ــــ لیکن اکثریت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی ۔ مختلف شرائط پر داشتائیں رکھتے ہیں ۔ یا پھر تین چار بے تکلف دوست مل کر ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے کر اس میں ایک یا دو لڑکیوں کو صرف اپنے لیے رکھ چھوڑتے ہیں ۔ یہ لڑکیاں خود کمانے والی بھی ہو سکتی ہیں اور طوائفیں بھی !

طوائفیں

وہ لوگ جنہوں نے اولین جنسی سبق کے لیے کسی طوائف کی طرف رجوع کیا انہوں نے بعد میں یہ بتایا کہ وہ کافی شراب پئے ہوئے تھے ۔ ہفتہ کی رات کو" جشن منانے والوں کی خاصی تعداد بنتی ہے ۔ جن آتشیں خون والوں نے پہلی مرتبہ طوائفوں کے ساتھ جنسی فعل کیا ان کی تعداد اعتدال پسندوں سے دوگنی ہے ان میں وہ لڑکے بھی شامل ہیں

جو چودہ اور پندرہ برس کی عمر میں جنسی زندگی کا آغاز کر بیٹھے تھے۔" میں بالکل کاروباری انداز سے چکلا میں چلا گیا" — "میں نے پیرس کی سڑکوں پر ایک بازاری عورت کو پھانسا" — "میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ قحبہ خانہ کس طرح کا ہوتا ہے" — "بلحاظِ ہیجانات میں بہت زیادہ جنسی ہوں۔ پہلی دفعہ جنسی فعل کے رموز واسرار سے واقفیت کے لیے میں ایک پیشہ ور عورت کے پاس چلا گیا تاکہ میں یہ جان سکوں کہ آئندہ جب جنسی آسودگی کے نسبتاً کم میکانکی مواقع آئیں تو مجھے کیا کرنا چاہیئے"۔

اَٹھتیس خون والوں میں سے دو تہائی کی جنسی زندگی کا آغاز ہائی سکول میں ہو چکا تھا اور ان میں سے ایک تہائی نے قحبہ خانوں میں جاکر طوائفوں سے اس کا افتتاح کر دیا۔ مجموعی لحاظ سے اس سارے گروہ میں۔ بشمولیت وہ جنہوں نے کالج تک خود کو روکے رکھا۔ ایسے مردوں کی تعداد ایک تہائی ہوتی ہے جنہوں نے اوّلیں جنسی تجربہ کے لیے طوائفوں کو چنا۔ ایسے افراد کی تعداد دس فیصد بنتی ہے جو کبھی بھی کسی طوائف کے پاس نہ گئے تھے حالانکہ ان میں ایسے مرد بھی شامل ہیں جنہوں نے اپنے طبقہ کی بے شمار لڑکیوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کیے۔ طوائفوں کے پاس جانے اور نہ جانے والوں کی اچھی خاصی اکثریت نے طوائف بازی کی مذمت کی۔

طوائفیت کے خلاف سب سے بڑا اعتراض بیماری مول لینے کا خطرہ تھا۔ یہ اعتراض کرنے میں وہ لوگ پیش پیش تھے جو خود ہی سب سے زیادہ ان کی سرپرستی کرتے رہے تھے۔ دیگر نقصانات یہ ہیں۔ عزتِ نفس کا خاتمہ، جذباتی ناآسودگی نام کو بٹہ لگنا اور ماحول کا گھٹیا پن۔ سوالنامے میں دیئے گئے جوابات میں ایسے کئی فقرات ملتے ہیں جن سے اس کراہت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ایک سترہ سالہ لڑکے نے جس کے آٹھ لڑکیوں کے ساتھ تعلقات رہ چکے تھے (ان میں سے چار طوائفیں تھیں) اس کے نقصانات کے ضمن میں لکھا: "زیادہ گندی" ایک اور نے لکھا: "بالکل میکانکی اور گھٹیا"۔ ایک انیس سالہ لڑکے نے (جس نے اب تک صرف اپنے ہی طبقہ کی لڑکیوں سے تعلقات رکھے تھے) اپنے خیالات کا ان الفاظ میں اظہار کیا: "بیماری کے خطرہ کے ساتھ ساتھ میرا اپنا صاف جسم بھی تو گندا ہوتا ہے"۔ چالیس طوائفوں سے جنسی فعل کے بعد ایک مرد نے اپنے تجربات کا نچوڑ یوں بیان کیا: "بیماری کا خطرہ، اور جمالیاتی حس کی پامالی" ایک اور نوجوان اس مسئلہ پر بحث کرنا چاہتا تھا کہ "کیوں نوجوان طوائفوں کے بغیر جنسی فعل نہیں کر سکتے حالانکہ وہاں سے سوائے شرم کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا"۔ انقلابی خیالات رکھنے والے صرف تین مردوں نے طوائفیت کی سماجی وجوہات کی بنا پر مخالفت کی ان کے ذہن میں لڑکی پر اس کے خراب اثرات تھے۔

جن چالیس فیصد اَٹھتیس خون والوں نے طوائف بازی کی حمایت کی تو ان کے نزدیک اس کے اہم ترین فوائد، سہولت اور ہر قسم کی ذمہ داری سے بری الذمہ تھے۔ ان کے نزدیک طوائف مرد کی ایک لازمی حیاتیاتی احتیاج کو پورا کرتے ہوئے بھی اسے نہ تو اپنے پلّے سے باندھتی ہے اور نہ ہی ایسے تعلقات میں حمل کا خوف ہوتا ہے علاوہ ازیں ایک تجربہ کار طوائف سے نئے نئے گُر بھی سیکھے جا سکتے ہیں۔ بیشتر نے طوائف بازی کو تعلقات کی کاروباری نوعیت اور سہل پسندی کے باعث پسند کیا۔ طوائف کے ساتھ جنسی تعلقات میں جو ایک غیر شخصی اور میکانکی انداز پایا جاتا ہے اکثر لوگ اسے ناپسند کرتے ہیں جب کہ ان لوگوں نے اس خصوصیت کے لیے ہی طوائفوں کو پسند کیا۔

ایک بڑی یونیورسٹی میں تعلیم پانے والے ایک نوجوان نے طوائف بازی کی حمایت ان الفاظ میں کی: "میرے خیال میں پہلے چند تجربات کے لیے طوائفوں کے ساتھ جنسی اختلاط زیادہ موزوں اور مفید ثابت ہوتا ہے۔ ایک طوائف کے ساتھ جنسی تعلقات میں ناآموزی کی خود شعوری سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے جس سے اس واقعہ میں کچھ ایسا بے ساختہ پن پیدا ہو جاتا ہے اس وقت تک جنسی فعل کو شرم وحیا اور پُراسراریت کے جن لبادوں میں لپیٹ لپیٹ کر رکھا گیا ہے وہ سب گویا چاک ہو جاتے ہیں میرے خیال میں اپنے لیے اخلاقی معیار رکھنے والے افراد چند مرتبہ کے بعد مستقلاً یا عادتاً طوائف بازی نہیں کر سکتے"۔

ایک وکیل کے بائیس سالہ بیٹے کی جنسی زندگی کا آغاز اٹھارہ برس کی عمر سے ہوتا ہے۔ اپنے طبقہ سے تعلق رکھنے والی ایک درجن لڑکیوں کے علاوہ تقریباً دو درجن طوائفوں سے بھی اس کے جنسی تعلقات رہ چکے تھے اس نے داشتہ رکھنے کا بھی تجربہ کیا لیکن یہ تجربہ کوئی خاص آسودگی بخش نہ ثابت ہوا۔ اس نے سوالنامہ کے جوابات میں ہر ممکن احتیاط اور ستھرے پن کا ثبوت دیا علاوہ ازیں اس کے بیجے بھی درست تھے۔ وہ بالکل غیر جذباتی اور دو اور دو چار قسم کا انسان تھا اور ہر معاملہ میں ذاتی منفعت کو مدنظر رکھتا۔ اب سوال یہ ہے کہ مستقبل میں اس کی ذہانت غلبہ پاتی ہے کہ تسکینِ خود کا رجحان — غالباً اوّل الذکر!

طوائفوں کی سرپرستی کے حق میں دلائل دینے والوں میں ایک بالکل ہی عجیب اور استثنائی قسم کے خیالات کا حامل نوجوان بھی ملتا ہے یہ ایک سیلز مین کا بیٹا تھا۔ اور اپنے گروہ میں یہ اپنی مثال آپ ہی تھا اسے ہر قسم کے امتناعات نے گھیر رکھا تھا۔ گو ہائی سکول کے زمانہ سے ہی اس نے "ہر قسم کی دستیاب لڑکی" کے ساتھ تعلقات استوار کیے لیکن یہ کبھی دامِ الفت میں گرفتار نہ ہوا۔ اس نے بڑے بوڑھوں پر شدید نکتہ چینی کی جو اس کے شدید ہیجانی پس منظر پہ روشنی ڈالتی ہے۔ اس کے خیال میں "پرانے لوگ نوجوانوں کی بیچارگی سے فائدہ اٹھا کر ان پر امرونہی کا جو بوجھ لاد دیتے ہیں وہ انسانی لحاظ سے بالکل غلط ہے"۔

اس نے اٹھارہ سال کی عمر میں پہلی مرتبہ جنسی فعل سے تعارف حاصل کیا اس کے بعد کے تین سالوں میں اس نے تیرہ لڑکیوں سے جنسی تعلقات استوار کیے ان میں سے چار طوائفیں تھیں۔ اس نے اپنے اوّلیں جنسی تجربہ کا نوجوانوں ایسے بے تکلفانہ انداز میں ذکر کیا ہے۔ وہ ایک طوائف کے ہاں گیا تھا انہیں مکمل تنہائی میسّر تھی "ایک کمرہ — ایک بستر اور صفائی کیلئے پانی"۔ پہل لڑکے نے ہی کی تھی لیکن وہ بہت ہراساں اور گھبرایا گھبرایا سا تھا۔ وہ اس طوائف سے دوبارہ کبھی نہ مل سکا لیکن تین سال کے بعد جب وہ اس کے بارے میں لکھنے بیٹھا تو اس کے لہجہ میں غم اور تشکر کا امتزاج تھا۔

"یہ طوائف عام طوائفوں کے برعکس تندمزاج نہ تھی بلکہ وہ مہربان اور ہمدرد طبیعت رکھتی تھی۔ جب اسے یہ احساس ہوا کہ میں پُرسکون ہونے کی بجائے کچھ اکھڑا اکھڑا سا ہوں تو اس نے مجھ سے کہا اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تم اپنی زندگی میں آنے والی لڑکیوں کو خاطر خواہ آسودگی بخش سکو تو اپنی حالت کو ٹھیک کر کے گھبراہٹ سے کام نہ لیتے ہوئے خود پر قابو رکھو۔ گو میں پہلے سے اس بات کو جانتا تھا لیکن اس کے سمجھانے سے میں خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے لیے یہ تجربہ بہت کامیاب اور تسکین بخش ثابت ہوا لیکن میں اس کے پیشہ کی وجہ سے اس کے ساتھ مستقل قسم کے

مصائب اور مشکلات سے بھری اس دنیا میں صرف اس کی ہستی میں اس کے مسائل کو سمجھ کر اسے مصائب سے بچا سکتی تھی۔

وہ خواہ دنیا کی خوبصورت ترین لڑکیوں کی محبت میں خود کو گرفتار کیوں نہ محسوس کرے۔ لیکن اس کی ماں کی شخصیت کا کوئی بھی مقابلہ نہ کر سکے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماں کی تمام خصوصیات اس کے تصور اور ذہن کی پیداوار ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ اسے اپنا آدرش اور معیار بنا کر عمر بھر کسی ایسی لڑکی کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے جو اس تخیلی ہیوئی پر سبقت لے جا سکے۔ لیکن یہ ایک جستجو ہے جس کی قسمت میں ہی نامرادی ہے اور یوں وہ اپنے ساتھ ساتھ ان لڑکیوں کی بھی زندگیاں خراب کرتا ہے۔

یہ نظریہ تقریباً ان ایک درجن آتشیں خون والوں کے ضمن میں ایک دلچسپ پس منظر کا کام کر سکتا ہے جو جنسی کردار کے اعتبار سے ڈون ژون سے کم نہیں۔ سوالنامہ میں ان کے جوابات سے اس نظریہ کی صداقت پر کوئی خاص روشنی نہیں پڑ سکی اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے میلانات کی جڑیں گہری ہوتی ہیں اس لیے آسانی سے ان پوشیدہ وجوہات کو بے نقاب نہیں کیا جا سکتا۔

ان کی نمایاں خصوصیت نیم پختگی ہے۔ کھلنڈرے قسم کے یہ لوگ اپنے کالج کے جلسوں اور محفلوں کی جان ہوتے ہیں۔ جب یہ دوسروں کے بارے میں گفتگو کرتے تو گویا انہیں محدب شیشہ میں سے دیکھتے۔ انہیں کبھی بھی یہ احساس نہ ہوا کہ بطور ایک طالب علم وہ کتابوں اور لڑکیوں پر جو وقت صرف کرتے ہیں اس میں بلحاظ تناسب زمین و آسمان کا فرق پایا جاتا ہے کیونکہ ان کا اولین مقصد تسکین خود اور ان کا سب سے بڑا ہتھیار ان کی انا ہوتی ہے اس لیے اس قسم کے احساسات سے یہ کبھی بھی پریشان نہیں ہوتے۔ ان کی فطرت ہر قسم کی پیچیدگیوں سے عاری ہوتی ہے اور ذہنی سطح بلند نہیں ہوتی اس لیے یہ زندگی کے پیچیدہ مسائل پر غور نہیں کر سکتے۔ بس سیدھی سادی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایک نے لکھا تھا "میں سیدھی سادی باتوں کو پسند کرتا ہوں۔" "جہاں تک جنس کا تعلق ہے تو وہ زیادہ تر ان کے لیے محض جسمانی وظائف کی حیثیت رکھتی ہے اور انہوں نے کبھی بھی ان گہرے روابط تعلقات نہ رکھ سکا۔"

اس لڑکے کے والدین کی ازدواجی زندگی تلخ تھی اور اسے ان میں سے کسی کے ساتھ بھی جنسی مسائل پر تبادلۂ خیال کا موقع نہ ملا تھا۔ پرانے لوگوں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار اور ایک گمنام اور غیر معمولی قسم کی ایسی طوائف کے لیے تشکر کے جذبات کا پایا جانا ــــ جو اس کے اناڑی پن کے جواب میں اس کے ساتھ مہربانی اور صبر و سکون کا سلوک کرتی ہے ــــ ان سے ایک ایسے حیران اور پریشان نوجوان کی تصویر سامنے آتی ہے جو حقیقت جاننے کے لیے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھر رہا ہو۔ بچوں کی نفسیات اور ترقی پسند تعلیمی نظریات کا پرچار اس بنا پر محض احمقانہ تفریح نظر آتا ہے اب بھی ہمارا معاشرہ کوئی ایسا مہذب طریقۂ کار وضع کرنے میں ناکام رہا ہے جس سے نوجوان لڑکوں کو مردانگی کے تقاضوں سے روشناس کرایا جا سکے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ چکلوں میں دھکے کھاتے اور امراضِ خبیثہ میں مبتلا ہوتے ہیں ایک غیر ذمہ دار آتشیں خون والا نوجوان خوب شراب پی کر اگر کسی قحبہ خانہ میں جا پہنچتا ہے تو وہاں اس پر کیا کچھ نہیں بیت سکتی اس حالت میں وہ جس قسم کے خطرات سے دوچار ہو سکتا ہے ان سے تجارت یا شرط بدنے کے معاملہ میں محترز رہے گا۔ ۳۴ تجربہ کار آدمیوں میں سے صرف دو آتشیں خون والوں نے یہ اعتراف کیا کہ انہیں کوئی جنسی بیماری ہو گئی تھی لیکن ہمارے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ ان میں سے کتنوں نے اس کا اعتراف نہ کیا۔

تو نہیں اور سہی اور سہی اور سہی

جب ہم ضرورت سے زیادہ ہرجائی اور حسن کا رس چوسنے والے بھنوروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو نسلی وراثت اور ماحول کے اثرات کی قدیمی بحث چھڑ جاتی ہے۔ ایسے انسان کی تشکیل میں گھر، سکول اور پس منظر کا کتنا کتنا کردار ہے؟ یا ایسا مرد واقعی پیدائشی شکاری ہوتا ہے؟؟

ڈون ژون[1] کے بھائی بندوں یعنی بھنورہ صفت ہرجائیوں کے بارے میں تحلیل نفسی نے بڑی خشک خشک باتیں کی ہیں ایسی خشک کہ ان سے ذہن میں جو رومانی تصورات ابھرتے ہیں وہ سبھی دب کر رہ جاتے ہیں۔ فرائڈ کے بقول کاڈنٹ ڈی کاسانوا[2] دراصل انتہا پسندانہ والدہ وابستگی کی ایک مثال ہے۔ کاسانوا کی زندگی ایک ایسے مرد کی مثال ہے جس کے ذہن سے تمام عمر یہ طفلانہ خیال نہ نکل سکا کہ دنیا میں اس کی ماں سب سے زیادہ عقلمند اور پر وقار عورت تھی وہ حسن اور شفقت میں لاثانی تھی۔

---

[2] کاسانوا (۲ مارچ ۱۷۲۵ تا ۴ جون ۱۷۹۸ء)۔ عالم، مہم باز اور عیاش کاسانوا اپنے دور کی عجیب و غریب شخصیت تھا اس کی جنسی مہمات کی داستانیں حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین معلوم ہوتی ہیں۔ اور وہ اس معاملہ میں ان امریکی "آتشیں خون والوں" کا "باپ" معلوم ہوتا ہے معزز بیگمات، طوائفیں، خادمائیں حتیٰ کہ اپنے ناجائز تعلقات سے جنم لینے والی بیٹی ــــ سبھی اس کا شکار تھیں۔ ایک ہی وقت میں بہنوں اور ماں بیٹیوں سے اس کے جنسی تعلقات ہوتے تھے۔ اس کی زندگی بھی نشیب و فراز کا عجیب مرقع تھی۔ آج معزز لوگوں کی محفل کی زینت بنا ہے تو کل جیل میں پڑا سڑ رہا ہے۔ یورپ کی بعض نامور شخصیات جیسے لوئیس ۱۵، روسو، والیٹر، فریڈرک اعظم اور کیتھرائن ثانی سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے اس کی خود نوشت سوانح حیات جو ۱۲ جلدوں پر مشتمل ہے اس کی جنسی مہمات کا پرجوش تذکرہ ہے۔ ہومر کی ایلیڈ کے منظوم ترجمہ کے علاوہ تاریخ وغیرہ پر اس کی کئی کتابیں لاطینی اور فرانسیسی میں ملتی ہیں۔ (س۔ و)

[1] یہ ہسپانیہ کی روایتی داستان کا ہیرو ہے۔ ڈون ژون بہت اوباش اور لاابالی طبیعت کا مالک تھا۔ اس نے سیول کے گورنر کی بیٹی کو اپنے دام ہوس میں الجھانے کی کوشش کی جب غضبناک باپ کو اس کی کرتوت کا علم ہوا تو اس نے ڈون ژون کو دعوت مبارزت دی جس میں اول الذکر قتل ہو گیا۔ نشہ میں سرشار ڈون ژون مرحوم گورنر کی قبر پر گیا اور اس پر ایستادہ مجسمہ کو لڑائی کی دعوت دی۔ مجسمہ میں جان پڑ گئی اور خوف و دہشت سے گنگ ڈون ژون کو بت نے داخلِ جہنم کیا۔ یہ روایت لاتعداد ڈراموں اور منظوم داستانوں کی صورت میں دہرائی جا چکی ہے۔ (س۔ و)

پر غور کرنے کی زحمت نہ گوارا کی تھی جو جنسی زندگی عطا کرتی ہے۔

ان میں سے چار کے باپ وکیل اور باقیوں کے بنک کار، سائنسدان، پادری اور تاجر تھے۔ ان میں سے نصف نے مستقبل کے لیے پدرانہ پیشہ منتخب کر رکھا تھا۔ یہ رجحان باقی آتشیں خون والوں کی نسبت بلحاظ تناسب بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ یہ لوگ باپ کے نقشِ قدم پر چلنے کے متمنی تھے اس لیے ظاہر ہے کہ یہ باغیانہ خیالات کے حامل نہ تھے۔ اس لیے انتہا پسندانہ جنسی کارکردگی کو گھر کے مروّجہ معاشرے کے خلاف کم ازکم بغاوت تو قرار نہیں دیا سکتا۔

ان کی جنس پرستی کے بواعث اگر اقتصادی حالات میں تلاش کیے جائیں تو اس کے حق میں یہ دلیل تو دی جا سکتی ہے کہ آتشیں خون والوں میں سے نصف نے پرائیویٹ سکولوں میں تعلیم حاصل کی تھی جب کہ ان کے مقابلہ میں تمام مردوں کی ایک تہائی نے ایسے اداروں میں تعلیم پائی تھی۔ امیر والدین کے ان بچوں کے پاس دولت، وقت اور مواقع کی کمی نہ تھی اس لیے یہ ان سب کو حصولِ مسرّت کے لیے فراخدلی سے خرچ کرتے ہیں اس قسم کے بچوں میں ایک خاص قسم کی غزور آمیز جبر ذمہ داری بھی پائی جاتی ہے۔ ان سب نے مل کر اس عیش کوشی کو ان کی فطرت ثانیہ بنا دیا ہو گا لیکن اس نظریہ کا ہم سب پر کامیابی سے اطلاق نہیں کر سکتے کیونکہ امیر والدین کے بعض ایسے لڑکے بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو بے حد محتاط اور متین طبیعت کے مالک تھے۔

ایک بنک کار کا بیٹا مخصوص قسم کی مثال ہے۔ اس نے ایک مشہور (پرائیویٹ) تعلیمی ادارہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اکیس برس کی عمر میں وہ ایک ایسی یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ جہاں مخلوط تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کی زندگی کا اولین جنسی معاملہ پندرہ برس کی عمر میں ایک معمر لیکن مطلقہ عورت کے ساتھ صرف دو گھنٹہ کی ملاقات کے بعد طے پا گیا تھا۔ جب چند دنوں کے بعد وہ اس شہر سے چلی گئی تو یہ قصہ بھی ختم ہو گیا۔

اس نے چالیس سے پچاس لڑکیوں اور دس طوائفوں کے ساتھ جنسی تعلقات کا دعویٰ کیا۔ اس دوران میں تین مرتبہ اس نے "محبت" بھی کی۔ اس کے (اور بعض احباب کے) کئی معاملات شراب کی وجہ سے معرض وجود میں آئے تھے اپنے جنسی معاملات میں ضبط کو "احمقانہ" قرار دیتے ہوئے بتایا کہ جب اس کی خواہش بیدار ہوتی تو وہ ہر طریقہ سے ایک لڑکی کا شکار کرتا۔ اگر اسے باکرہ بیوی نہیں ملتی تو کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ وہ تو اپنے ایسی ہی کسی لڑکی سے شادی کرے گا۔ لیکن "اس کا انحصار خود اس لڑکی پر ہوگا" اپنے وسیع جنسی تجربات کے باوجود بھی اسے اپنے بارے میں یہ یقین نہ تھا کہ وہ کسی باکرہ لڑکی کو خراب کرے گا کہ نہیں۔ وہ اپنی بیوی سے جنسی وفاداری کا طالب تھا لیکن اپنے بارے میں وہ وثوق سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔

اس نے عورتوں کے بارے میں جو خیالات ظاہر کیے وہ اس کے اپنے کردار کی ضد تھے اس کا اب تک کا کردار یہ رہا تھا کہ مطلب برآری کے بعد عورت کی پرواہ مت کرو لیکن نظریاتی لحاظ سے اس کے خیالات اچھے خاصے ترقی یافتہ معلوم ہوتے تھے دراصل وہ کھلنڈرے کی ایک مخصوص مثال تھا اسے دوسروں کی نسبت دولت کی فراہم کردہ زیادہ سہولتیں میسّر تھیں۔ اس لیے وہ خوش باش ہونے کے ساتھ ساتھ روایات کا پابند اپنے آپ میں گم تھا۔ ذاتی لحاظ سے وہ ایسی کوئی خاص خصوصیات نہ رکھتا تھا۔ جو اسے دوسروں پر فوقیت دیتیں۔ یہی حال اس کے سوالنامہ کا تھا۔ اس میں ایک جواب بھی ایسا نہ تھا جو اسے دوسروں سے نمایاں کرتا۔ اگر کوئی بات متاثر کرنے والی تھی تو وہ لڑکیوں کی زیادتی اور پہلے معاملہ کا دو گھنٹوں میں طے پا جانا تھا۔

اس قسم کے مردوں میں سے بعض نے ایسے فقرات استعمال کیے ہیں جن سے یہ آشکار ہوتا ہے کہ جنس کی تمام کشش اور سحر کاری کے باوجود ان کی حالت کچھ ایسی ہے۔

عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

ایک اٹھارہ سالہ لڑکے — جسے اپنی شکار لڑکیوں کی تعداد بھی یاد نہ تھی۔ لوگوں کو طوائفوں کے پاس جانے کا مشورہ دیا تھا تاکہ "وہ جنسی فعل کے کھوکھلے پن کو دماغ کر سکے"۔ ایک دوسرے طالب علم کو کیسلے کے ساتھ اس امر پر اتفاق تھا کہ "جنس کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے"۔ ایک اور نے زمانہ طالب علمی میں کی جانے والی شادیوں کی اس بنا پر مخالفت کی کہ لڑکے اور لڑکی کا "بہت جلد ہی ایک دوسرے سے دل بھر جائے گا"۔

عورتوں کے بارے میں روّیہ

آتشیں خون والوں کا طرزِ عمل ایسا ہوتا ہے کہ یہ دیگر طلبا میں ممتاز حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ ہرجائی پن تو گویا ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے کیونکہ عورت کے جسم کی تسخیر ان کا اہم کارنامہ ہے اسی لیے ان کے بارے میں ان کے ذہنی اور ہیجانی انداز نظر فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ان کے اندازِ فکر کا عملی پہلو اس سے عیاں ہو جاتا ہے کہ ان کے معاشقوں کے نتیجہ میں اگر کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے تو یہ صرف خود ہی کو قصوروار نہیں سمجھتے بلکہ عورت بھی برابر کی شریک کار ہے۔ آتشیں خون والوں میں سے تقریباً دو تہائی نے اس سوال کا جواب گول کر دیا کہ ان کے تعلقات کا نتیجہ کبھی حمل کی صورت میں بھی ظاہر ہوا کہ نہیں؟ حتیٰ کہ وہ مرد جنہوں نے سب سوالات کے جواب دیئے انہوں نے بھی یہ خانہ خالی چھوڑ دیا۔ صرف ایک درجن مردوں نے یہ تسلیم کیا کہ انہوں نے لڑکیوں کو حاملہ کر دیا تھا۔ ایک سوال یہ تھا کہ اگر لڑکی حاملہ ہو جاتی ہے تو اس صورت میں وہ کیا کیا کریں گے۔ تو صرف آتشیں خون والوں کی ایک تہائی نے شادی کر لینے کا جواب دیا تھا جب کہ اس جائزہ کے تمام جنسی تجربہ کار مردوں میں سے ۴۷ فیصد نے شادی والا جواب دیا تھا۔ مردوں کی خاصی اکثریت نے یہ جواب دیا کہ اسقاطِ حمل کے لیے وہ ہر طرح سے لڑکی کی امداد کریں گے۔ تمام مردوں میں سے صرف دس نے — ان میں سے آٹھ آتشیں خون والے تھے — یہ لکھا کہ وہ سب معاملہ لڑکی پر چھوڑتے ہوئے خود کو ہر طرح سے بری الذمہ قرار دے دیں گے۔ اب یہ لڑکی کا معاملہ ہے وہ جس طرح چاہے اس مسئلہ کو سلجھائے۔ ان آٹھ میں سے چھ نوراتی معلوم ہوتے تھے۔

"مجھے اس کے باعصمت ہونے سے کوئی غرض نہیں"؟

یہ الفاظ سولہویں صدی عیسوی میں سر والٹر ریلے نے ادا کیے تھے — یہ سوال محض جوشِ خطابت کی پیداوار تھا لیکن جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ عورت کے باعصمت ہونے سے غرض رکھتا تھا۔ لیکن آپ لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکیں گے کہ آج کے نوجوان نے اب اسے حرزِ جان بنا لیا ہے۔

گو نوجوان اب بھی ایسی عورتوں میں بلا کی کشش اور سحر انگیزی محسوس کرتے ہیں جن کا حصول ناممکن ہو۔ لیکن عورت کے بارے میں مردوں کا اساسی روّیہ اب [illegible] غیر رومانی اور عمل بن چکا ہے۔

بقول ڈین گاسی:

"اب وہ تمام ثانوی نفسیاتی خصائل ختم ہو چکے ہیں جن کی بنا پر کبھی مرد "مرد" تھا اور عورت "عورت" تھی اور ان دونوں کا جداگانہ بیان ہوتا تھا۔
اب تو یہ صرف نام ہی کے مرد اور عورت ہیں۔"

وہ الفاظ جو سولہویں صدی میں سر والٹر ریلے نے کہے تھے آج کے نوجوانوں کی اکثریت کے ذہنوں میں ان کی بازگشت ملتی ہے۔ آتشیں خون والوں میں سے ۹۰ فیصد نے یہ کہا کہ ان کی بیوی کے لیے باعصمت ہونا لازمی نہیں تقریباً تین چوتھائی نے ایک باعصمت لڑکی سے شادی نہ کرنے کے خیال کا اظہار کیا جب کہ اتنے ہی مردوں نے یہ بتایا کہ کسی لڑکی کی عصمت ان کے لیے بالکل بے معنی تھی "لا یعنی"۔ "دیگر عوامل کو زیادہ اہمیت حاصل ہے" ۔ "اس کا انحصار تو لڑکی پر ہے اور یہ کہ مجھے اس سے محبت ہے کہ نہیں"۔

اسی سوال کے سلسلہ میں ایک اور سوال کیا گیا تھا کہ کیا وہ کسی باکرہ لڑکی کو جنسی راستے پر چلانے کے لیے تیار ہیں یا نہیں؟ ان کے جوابات اس مخصوص کشمکش کے آئینہ دار تھے جو نئی اور پرانی اقدار کے درمیان جاری چلی آتی ہے اور جس کے نتیجہ میں جوری دوُر پر غضبناک لہجہ میں تنقید کی جاتی ہے۔ صرف ۳۰ فیصد نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ بغیر جھجک کے ایسا کر گزریں گے ۔ اور انہوں نے ایسا کیا بھی تھا اس اقلیت میں محولا بالا وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے بڑے فخر سے باکرہ لڑکیوں کو ورغلانے کا تذکرہ کیا تھا۔ جن ۷۰ فیصد نے اس بارے میں تذبذب اور ہچکچاہٹ کا ثبوت دیا تھا۔ انہوں نے لاشعوری طور پر خود کو اس جانباز بہادر کے روپ میں پیش کرنے کی سعی کی تھی جو کنواریوں اور دوشیزاؤں کا محافظ ہوتا ہے۔

کالوں سے متعلق ایک اونچے عہدہ دار کا انیس سالہ بیٹا بڑا عملی قسم کا معلوم ہوتا تھا اس نے اپنے پیشہ کی حیثیت سے تجارت کو منتخب کر رکھا تھا۔ اس نے آج تک کسی سے محبت نہ کی تھی اس کے آٹھ یا دس لڑکیوں کے ساتھ تعلقات رہ چکے تھے وہ کبھی کسی طوائف کے پاس نہ گیا تھا۔ اس کے خیال میں اس کی بیوی کے لیے باکرہ ہونا لازمی شرط نہ تھی لیکن جب ایک باکرہ لڑکی کی عصمت کا سوال آیا تو اس نے بہت زیادہ محتاط ہونے کا ثبوت دیا۔ اس نے بڑے پر زور انداز سے یہ لکھا کہ وہ کبھی دوشیزہ کے شیشۂ عصمت کو چکنا چور نہیں کر سکتا اور اس کے خیال میں ایسا کرنے والا مرد ذلیل ترین جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔

نیویارک میں رہنے والے ایک مرد نے لکھا: "میں اس معاملہ میں ضرور ہچکچاہٹ سے کام لوں گا اگر وہ میری بیوی نہیں تو میں پہلا مرد بننا پسند نہ کروں گا" بعض کے جوابات میں جانباز بہادر کے ساتھ ساتھ طنزیہ انداز بھی کار فرما ملتا ہے۔ ایک مرد نے اپنے تجربات کا نچوڑ یوں بیان کیا "اجی یہ باکرہ لڑکیاں اچھی خاصی دردِ سر ہوتی ہیں" ایک اور نے لکھا "اگر مجھے کوئی باکرہ لڑکی ملتی ہو تو میں ہرگز اس کے ساتھ جنسی اختلاط نہ کروں گا۔ بشرطیکہ مجھے یہ یقین ہو جائے کہ اسے اپنی عصمت گنوانے کا افسوس ہو گا۔"
"ایک آدمی نے یہ معیار قائم کیا "وہ چودہ سالہ لڑکی کے ساتھ کچھ کرتے وقت سوچ بچار سے کام لے گا لیکن سترہ سال کی لڑکی کو کبھی بھی نہ چھوڑے گا"۔

اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہ وہ کسی قسم کی لڑکی کے ساتھ "ڈیٹ" کرنا پسند کریں گے ۱/۲ آتشیں خون والوں نے بتایا کہ وہ ایسی لڑکی کو ترجیح دیں گے جو "انکار کرنے" والی ہو۔ ۱/۲ کے نصف نے "ہاں" اور "نہ" کرنے والیوں کے بارے میں لاتعلقی ظاہر کی۔ جب کہ بقیہ نصف نے "اقرار کرنے" والیوں کو پسند کیا یہ ایک دلچسپ تضاد ہے کیونکہ ناتجربہ کار لڑکوں کی دو تہائی نے "انکار کرنے" والیوں کو پسند کیا۔ حالانکہ انہوں نے بیوی کے لیے باکرہ ہونے کی شرط کو لازمی نہ قرار دیا تھا۔

اس استفسار کے جواب میں کہ کیا وہ ہرجائی یعنی جنسی کردار کے لحاظ سے غیر ذمہ دار عورت کے ساتھ شادی پسند کریں گے؟ آتشیں خون والے نصف نصف تھے بعض نے "جنسی کردار کے لحاظ سے غیر ذمہ دار عورت" کی تعریف کرتے ہوئے غیر ذمہ داری کی حدود بھی متعین کیں جب کہ بعض نے لفظ ہرجائی کے بارے میں وضاحت طلب کی۔ ایک طالب علم نے لکھا کہ "ہرجائی عورت ایسی عورت ہے جو ہر اس مرد کے ساتھ جنسی فعل کے لیے تیار ہو جائے جو اس کی تکلیف گوارا کرنے کو تیار ہو۔ لیکن بے شمار مردوں کے ساتھ جنسی فعل کے باوجود بھی اسے ہرجائی نہیں سمجھا جا سکتا ہے" ایک مرد نے تجرباتی انداز میں یوں لکھا: "میرے لیے ہرجائی لڑکی ٹھیک ہے بشرطیکہ وہ اپنے ذہن میں توازن برقرار رکھے۔" جب کہ ایک اور نے اپنے خیال کا یوں اظہار کیا: "شادی کے لیے باکرہ کی خواہش؟ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ اتنی دیر تک باعصمت کیسے رہ گئی؟ ویسے میں ٹکیایوں کے خلاف ہوں"۔

دو عملی

ان ہرجائی لڑکوں کی محدود اقلیت نے ان لڑکیوں کے خلاف معاندانہ جذبات کا اظہار کیا جو اپنی آسودگی اور تسکین کے معاملہ میں ہر طرح کی آزادی سے کام لیتی ہیں۔
"مجھے ہرجائی لڑکیوں کے ساتھ ہر قسم کا تعلق ناپسند ہے" ۔ "مجھے ان سے نفرت ہے" "حقارت اور رحم" ایک معالج کے بیٹے نے ۔ جس کے چالیس لڑکیوں کے ساتھ جنسی تعلقات رہ چکے تھے۔ بڑے سرد لہجہ میں اس پر زور دیا کہ ایسی لڑکیاں "ایک خطرہ ہیں اور ان سے دوری ہی بہتر ہے"۔

ہرجائی لڑکیوں کا وجود نہ برداشت کرنے والے یہ تنگ نظر نوجوان ابھی زمانہ سے بہت پیچھے ہیں۔ گو وہ اس کی حقارت سے تردید کریں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ایک کہنہ روایت یعنی دو عملی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے ان کے پاس پرکھ کے لیے دو معیار ہیں۔ ایک معیار ان لڑکیوں کو جانچنے کے لیے جن سے وہ شادی کر سکتے ہیں اور دوسرا معیار ایسی لڑکیوں کے لیے جو محض تفننِ طبع کا ذریعہ ہیں ۔ طوائف کسی معیار کے لیے بھی نہ تھی کیونکہ اس کا وجود تو ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے اس لیے جب انہوں نے پانچ یا چھ لڑکیوں کی تعداد گنوائی تو دس بیس طوائفوں کو نہ گنا جن کا کسی اور جگہ وہ حوالہ دیے جاتے ہیں۔

دو معیار رکھنے والے یہ مرد باکرہ بیوی کو پسند کرتے ہیں۔ جب کہ ان کے اپنے کارناموں کا کچھ ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ بعض استثنائی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ایک معود نے (جس کے ایک درجن لڑکیوں سے تعلقات رہ چکے تھے) باکرہ لڑکی سے شادی کرنے کا لکھتے ہوئے بعد میں معذرتی انداز سے ان سطور کا اضافہ کیا "مجھے احساس ہے کہ یہ خود غرضی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ۹۰ فیصد اپنی بیوی میں اس خصوصیت کو ضرور چاہیں گے" ایک نوجوان سائنسدان نے ۔ جس کے تیس سے پینتیس لڑکیوں کے ساتھ تعلقات رہ چکے تھے۔ اس خیال کا اظہار کیا کہ گو وہ اپنی بیوی کے لیے باکرہ ہونے کی شرط کو لازمی نہیں قرار دے سکتا لیکن "میں اسے پسند ضرور کروں گا۔ ویسے میرا یہ عقیدہ ہے کہ اخلاقیات میں دو عملی بڑی چیز ہے"۔

یہ آتشیں خون والوں کے کردار کا ایک خاص پہلو ہے کہ انہوں نے باقیوں کی

نسبت دو عملی کی طرف اپنا رجحان زیادہ ظاہر کیا۔ ان میں سے ۱۰ فیصد میں یہ رجحان پایا گیا۔ البتہ اب یہ دیکھنا باقی رہتا ہے کہ بقیہ ۹۰ فیصد بھی اپنے دعویٰ پر پورے اترتے ہیں کہ نہیں۔ گو سوالنامہ پُر کرتے وقت انہوں نے عورت کی عصمت سے لاتعلقی ظاہر کی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ جب وہ شادی کرنے لگیں تو وہ آج کی نسبت اسے کہیں زیادہ اہم تصور کریں۔

ایک طویل مدت سے مرد اپنی عورتوں سے تحفظِ عصمت اور وفاداری طلب کرتے آئے ہیں اور انہوں نے عورتوں پر ہر ممکن طریقہ سے اسی کا نفاذ کیا ہے اس ضمن میں سماجی ضوابط، قوانین، تعزیرات، ایذاؤں اور موت تک سے بھی کام لیا گیا ہے۔

سماجی روایات کے طالب علم اس نکتہ کو نظر انداز نہ کر سکیں گے کہ جیسے جیسے عورت اقتصادی لحاظ سے آزاد ہوتی گئی مردوں کے رویہ میں "برداشت" کا عنصر بڑھتا گیا۔ صدیوں سے عورتوں کے پاس کوئی ایسا پیشہ نہ تھا جس سے وہ آزادانہ خود کفیل ہو سکتی ہیں اس لیے عورت بیوی، بیوہ یا طوائف بننے پر مجبور تھی۔ مرد عورتوں سے ہر طرح کے مطالبات کر سکتے تھے اور اپنی من مانی کرنے کے لیے ان کے پاس وسائل اور ذرائع کی کمی بھی نہ تھی۔ لیکن کچھ عرصہ سے عورت کو جو اقتصادی آزادی ملی تو اب صورت حال کچھ اور رہی ہے اور اب نئی نسل کے مرد ذہن خود کو حالات کے ساتھ ساتھ بڑی تیزی سے تبدیل کرتے جاتے ہیں۔

ہم ایک سو یا دس حتیٰ کہ دو مردوں کے بارے میں بھی عمومی نتائج نہیں اخذ کر سکتے۔ کیونکہ ہر مرد اپنے ہی اصول، قوانین کا تابع ہوتا ہے جس طرح ایک انسان کے انگوٹھے کے نشانات دوسرے سے نہیں ملتے اسی طرح کسی نہ کسی معاملہ میں ایک مرد دوسرے سے جداگانہ انداز ہی کا حامل ثابت ہوتا ہے۔ بچپن کے حالات کے تحت اس کی شخصیت کی تشکیل میں جو ہیجانات اور امتناعات کارفرما ملتے ہیں ان کی وجہ سے اگر وہ ایک چیز کے بارے میں پٹھان ایسا سخت نظر آتا ہے تو کسی دوسرے معاملہ میں اسے ایک بچہ کی مانند منایا اور بہلایا جا سکتا ہے۔

آتشیں خون والے تمام کے تمام ہی عملی یا انانیت پسند نہ تھے۔ بعض حساسیت اور گرم دلی رکھتے تھے۔ البتہ سبھی میں متناقضانہ رجحانات و میلانات کارفرما ملتے تھے۔ ایک لڑکے نے سترہ برس کی عمر میں پہلی مرتبہ جس لڑکی کے ساتھ جنسی تعلقات استوار کیے وہ اس سے پانچ برس بڑی تھی آج چار سال بعد جب اس نے ماضی کے اس واقعہ کا تذکرہ کیا تو اس نے خود تعلقات ختم کرنے کی یہ وجہ بتائی: "وہ جنسی لحاظ سے بہت قوی تھی"۔ حالانکہ اس دوران میں وہ خود پندرہ لڑکیوں کے ساتھ جنسی اختلاط کر چکا تھا۔

بعض اوقات جوانی کے پیدا کردہ شاعرانہ انداز بیان کے ساتھ اولیں واقعہ کا تذکرہ کیا گیا ہے: "ہم دونوں اس کے گھر میں تنہا تھے۔ اس کی شادی کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا وہ مجھ سے کچھ ہی بڑی تھی۔ وہ انیس سال کی تھی۔ وہ فیشن ایبل اور مسحور کن تھی"۔ سب سے زیادہ رومانی اندازِ نگارش ان واقعات کے ضمن میں ملتا ہے جنہوں نے گرما کی تنہائیوں میں جنم لیا "رات کافی بیت چکی تھی اور ہم تاروں بھرے آسمان تلے کھلے میدان میں تھے" — "درختوں کی چھاؤں تلے ایک ویران ساحل"

ایک اکیس سالہ طالب علم نے جنسی تجربہ کے بارے میں اپنے احساسات کو یوں بیان کیا: "اس میں حسن اور تسکین ہے یہ احساسِ ذات ہے"۔ ایک اور نے بتایا کہ لڑکیوں کے ساتھ جنسی تعلقات کی وجہ سے "مجھے اپنے اندر تاریک گہرائیوں کا علم ہوا" ایک اور اکھڑ قسم کے مردلے — جس نے زندگی میں متنوع قسم کے تجربات کیے — یہ لکھا کہ جنسی معاملات کی وجہ سے ہی اسے "ایک عورت کے جسم کی خوبصورتی کا احساس ہوا" ایک نوجوان مصور نے محبت کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا "کبھی یہ ایک بندھن ہے تو کبھی مشعل!"

جامع خاکہ

آتشیں خون والوں کا ایک مکمل اور جامع خاکہ تضادات سے بھرپور رہے گا۔ عام عقیدہ ایسے جذباتی نوجوان کے حق میں ہے جو بغیر جھجکے سب کچھ کر گزرتا ہے جو "ہر طرح کے خطرات مول لیتا ہے اور غلطیوں کا شمار نہیں کرتا۔" رومانی ادب اور فلموں نے ایسے جذباتی کردار وضع کیے جو کسی مرحلہ پر محبت کے زیر اثر سدھر جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ فلمیں ایسا مواد پیش کرتی ہیں جن کے ساتھ سامعین اپنی تطبیق کر کے لطف اندوز ہو سکیں۔ گذشتہ کچھ عرصہ سے کیونکہ اخلاقی ضوابط میں لچک پیدا ہو چکی ہے اس لیے اب ہیرو کے سدھار پر اتنا زور نہیں دیا جاتا اور گو اب فلمی کہانیاں کچھ اور ہی بن گئی ہیں لیکن ہیرو پھر بھی ویسا ہی خوش باش اور خوش فکر رہے۔ لمبے چوڑے ڈیل ڈول کے باوجود وہ دل کا برا نہیں۔ بلکہ اس کا دل تو سونے کا ہے!

جب ہم انفرادی مثالوں کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں تو فلمی دیوتاؤں اور رستا لکھنے والوں نے ایسے لوگوں کے گرد جو ایک رومانی روشنی کا ہالہ بنا رکھا ہے اس کا طلسم باطل ہو جاتا ہے۔ آتشیں خون والے سماجی تقاضوں سے منہ موڑ کر صرف اپنی ذات کو مرکز بنا کر اپنے آپ میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا پہلا اور آخری مقصد تسکین ذات اور آسودگی ہوتا ہے۔ یہ لوگ جذباتی ہوتے ہیں اور جذباتی لوگوں کی یہ خاصیت ہے کہ وہ پیش بینی اور پس بینی نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگوں کو نہ مستقبل کے بارے میں تنبیہ کی جا سکتی ہے اور نہ ہی یہ ماضی کی غلطیوں سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

ذاتی لحاظ سے یہ مقبول ترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ متنوع شخصیت اور پرجوش انداز ان کی خاص خصوصیت ہوتا ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح یہ امتناعات اور خوف سے آزاد ہوتے ہیں اگر یہ وقت پر اپنے آپ پر جبر اور ضبط کر سکیں تو ان کی باقی صلاحیتیں ایک عالم کو تسخیر کر سکتی ہیں۔

گلبرٹ چیسٹرٹن کے بقول۔

کسی مکان کی مالکہ کے لیے اس کے کرایہ دار مرد کا فلسفۂ حیات سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس لیے ہم کالج کے طلبہ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ کالج میں چار سال نظم و ضبط سے گزارنے کے بعد وہ بھی اپنے لیے کوئی فلسفۂ حیات وضع کر لیں اگر وہ ایسا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو کم از کم انہیں یہ علم تو ہو کہ وہ زندگی میں کن اقدار کی سربلندی کے خواہاں ہیں۔ انتخاب و امتیاز کی صلاحیت ہی معیارِ تہذیب ہے۔ ڈورتھی ڈینبر بروملے / فلورنس ہیکسٹن برٹن

وہ دادِ شباب دیتی ہیں

ایام گذشتہ میں اچھے اور باعزت گھرانوں کے جوان مردوں کے لیے دادِ شباب اور عیش و نشاط کی زندگی لاابالیان کا حق سمجھی جاتی تھی مگر آج اسی استحقاق میں لڑکیوں کی ایک قلیل تعداد بھی ان کی ہمسری کی دعوے دار بن چکی ہے سماجی لحاظ سے یہ ایسے مردوں کے برابر ہیں۔ آزادانہ اور بلا کھٹکے ہر جگہ جانے والی یہ آزاد لڑکیاں ہر لحاظ سے من موجی ثابت ہوتی ہیں۔ اپنے افعال و کردار کے بارے میں یہ کسی

جھجک کی قابل نہیں آزاد جنسی گزارنے والی ان لڑکیوں کو باغی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ اپنے افعال پر کبھی سوچ بچار کی زحمت گوارا نہیں کرتیں اور خود شباب کے گھوڑے کی لگام تھامنے کی کوشش نہیں کرتیں۔ ہم سب کی مانند یہ بھی انا کی تسکین کی خواہاں ہیں اور اگر وہ مشتبہ قسم کی سماجی کامیابی ہی سے یہ تسکین پاسکتی ہیں تو یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ بدقسمتی سے ان لڑکیوں کی انا نے غلط معائیر کو اپنا لیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ گھر میں یہ محبت اور تحفظ سے ناآشنا رہی ہوں، گھر کا ماحول کڑا اور تنگ نظر ہو سکتا ہے، پریشان کن گردوپیش میں نشوونما بھی ایک باعث ہوسکتی ہے اور یا پھر ان کی شخصیت میں کوئی خامی ہوگی۔ بعض زندگی کا آغاز اعلیٰ تصورات اور ارفع افکار سے کرتی ہیں لیکن ناامیدی اور شکست کے ہاتھوں اپنے معاشرہ اور خود سے بدلہ کی خاطر دادِ شباب دینی شروع کردیتی ہیں۔

آزاد جنسی زندگی گزارنے والی لڑکیاں جنس کی مانند شراب کو بھی ذریعہ فرار بنالیتی ہیں اور اکثریت حصولِ تعلیم کے لیے نہیں بلکہ دل کے ارمان نکالنے کے لیے کالج آتی ہیں۔ بعض اوقات پہلے اور دوسرے درجے کی طالبات میں استثنائی مثالیں بھی نکل آتی ہیں۔

ایسی لڑکیوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے لیکن ان ہی کے اندازِ واطوار کے باعث عموماً کالج کی لڑکیوں پر آزادروی اور خام کرداری کا لیبل چسپاں کردیا جاتا ہے۔ ۲۷۷ میں سے صرف ۲۵ انڈرگریجویٹ لڑکیوں نے یہ اعتراف کیا کہ ہم ہر موقع پر جنسی تسکین کے لیے تیار رہتی ہیں اور یہ کل تعداد کا صرف ۹ فیصد ہیں۔ لیکن ان ہی کا ہر زبان پر چرچا ملتا ہے۔

پس منظر

یہ لڑکیاں ہر طرح کے گھرانوں سے متعلق تھیں۔ تاجر، دکاندار، سرکاری ملازمین اور آسودہ حال سبھی طرح کے باپوں کی بیٹیاں ملتی ہیں۔ والدین کی ازدواجی زندگی کو کامیاب قرار دینے والی لڑکیوں اور ان کا تناسب مساوی تھا۔ اسی طرح تمام لڑکیوں کے تناسب کے مطابق تقریباً اتنی ہی تعداد نے بتایا کہ ان کے والدین مذہبی معیار پر کردار کو پرکھتے تھے۔ لیکن تجربہ کرنے والی لڑکیوں کے گروہ کی مانند یہ اپنے والدین کے ساتھ مسائل جنس پر گفتگو نہ کرسکتی تھیں بلکہ بعض کو تو گھر سے معمولی سی جنسی معلومات نہ مل سکیں۔ اسی گروہ میں سب سے زیادہ عدم مطابقت رکھنے والی لڑکی نے محض گھر کے ضرورت سے زیادہ اخلاقی ماحول کے خلاف بغاوت کی تھی۔ یہ لڑکی نری احمق نہ تھی بلکہ عام معیار سے زیادہ ذہین تھی۔

اوّلیں تجربہ

نصف لڑکیاں کالج آنے سے قبل جنسی اختلاط کا تجربہ کرچکی تھیں ان میں سے کچھ کو تو اتنا بھی نہ معلوم تھا۔ بقول ایک لڑکی "یہ سب کیا کچھ تھا؟" ان میں سے بعض کے ہائی سکول کے لڑکوں اور بعض کے کالج کے طلبا سے تعلقات تھے ایک لڑکی نے پرائیویٹ سکول میں تعلیم پائی تھی اس نے پندرہ سال کی عمر میں سکول میں شہ سواری کے استاد کے ساتھ تعلقات استوار کیے جب کہ ایک اور نے سکول کے آخری سال میں ایک شادی شدہ مرد کے ساتھ تعلقات پیدا کیے۔ دو تین اور لڑکیوں نے اس وقت ان تعلقات کو اپنی محبت پر مبنی سمجھا تھا لیکن کالج سے پہلے جنسی زندگی کا آغاز کرلے والی دیگر تمام لڑکیوں نے یہ سب کچھ حصول تجربہ یا شدت جذبات کے ہاتھوں مجبور ہوکر کیا۔ اکثریت نے ہائی سکول میں شراب نوشی کی پارٹیوں میں شرکت کا اعتراف کیا۔ ایسی لڑکیوں کی بھی کافی تعداد نکلی جنہیں شراب نوشی کی اجازت نہ تھی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہائی سکول کی طالبات میں شراب نوشی اور جنسی تجربات کا جام دینا ایسا ساتھ ضروری نہیں۔

خواہ کالج آنے سے پہلے جنسی زندگی کا آغاز ہوا یا بعد میں۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ سبھی شروع سے ہی اس معاملہ میں لاپرواہ تھیں۔ بعد میں یہ لاپرواہی مزید شدت اختیار کرگئی۔

"پہلی مرتبہ یہ سب کیسے ہوگیا؟"

جب ہم نے انٹرویو میں یہ سوال کیا تو ان میں سے بعض کے لیے ناکام محبت ایک سبب بنی۔

"وہی پرانا مقصد — محبت" ایک لڑکی نے تلخی سے بتایا "اس نے مجھے ٹھکرا دیا اور اس کے بعد میں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا جو ہوتا ہے ہو!"

لیکن سب نے پہلے محبت میں گرفتار ہونے کا دعویٰ نہ کیا۔ ان میں سے ایک کو چھوڑ کر باقی سب ان آدمیوں کو کم ازکم دو ماہ سے ضرور جانتی تھی۔ جب کہ کچھ کی ان مردوں سے سال بھر سے زیادہ کی واقفیت تھی۔ یہ تو تھے پہلے مرد — لیکن بعد میں مردوں کی تعداد اور وقفۂ ملاقات ایسا نہیں رہتا۔

جب پہلے تجربہ کے بعد انہیں معلوم ہوگیا کہ یہ سب کیا کچھ تھا تو پھر انہوں نے اس کو اپنا شعار بنالیا۔ کیونکہ اس سے باز رہنے کے لیے ان کے پاس کوئی وجہ نہ تھی گو اوّلیں جنسی تجربہ اکثریت کی توقعات کے عین مطابق نہ تھا لیکن پھر بھی مناسب حالات کے تحت انہوں نے اس امر کے ساتھ سلسلہ جاری رکھا۔ لیکن تجربہ کرنے والیاں کیونکہ ہیجان ہیجک کی قائل تھیں اس لیے انہوں نے اپنی توقعات کے برعکس تعلقات کے اجراء کو مفید نہ سمجھتے ہوئے انہیں منقطع کرلیا۔ ان کی تربیت، ماحول، تعلیم اور غالباً نسلی وراثتی خصوصیت انتخاب پسندی کی متقاضی تھیں۔ لیکن دادِ شباب دینے والیوں کی ایسی حالت نہ تھی۔ ان کی شخصیت میں ایسی قوتوں کا فقدان ملتا ہے جن کے باعث جنس کو ایک راستہ پر ڈال کر کسی خصوصیت کے تابع کرنا ممکن ہوسکتا ہے ان کے لیے تو سبھی مرد ایک ایسے تھے۔

"... اس کے خلاف کوئی دلیل نہیں"

ایک لڑکی نے بتایا "میری خودسپردگی کی سب سے بڑی وجہ لڑکوں کا مسلسل اصرار ہے اور اس کے خلاف مجھے کوئی اچھی دلیل نہیں سوجھتی" اس کے لیے اختلاط ایک پرلطف شام سے زیادہ اور کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ جب کہ دوسری لڑکیوں نے "ڈیٹنگ" کے ایسے معاملات کا کوئی اچھے الفاظ میں تذکرہ نہ کیا تھا۔ شاید وہ لڑکوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہ جانتی تھی اور ہوسکتا ہے کہ اسے ایک تجربہ سے دوسرے تجربہ کو ممیز کرنا بھی نہ آتا ہو۔ کمزور شخصیت کی حامل لڑکیاں تجسس، جنسی تحریک، جوش اور مہم جوئی کے جذبات ایک پرلطف شام کی توقع یا مرد پر وقتی قابو کی خاطر اپنے جسم ان کے حوالے کردیا کرتی ہیں بقول ایک لڑکی۔

"جب کسی مرد سے محبت ہو تو میں صرف اسے یہی کچھ دے سکتی ہوں"

ایک طالبہ مخلوط درسگاہ سے تعلیم کے بعد یہاں آئی تھی اس کے گھر کا ماحول تلخ تھا اس کی جنسی معلومات محض چند فحش کہانیوں سے اخذ شدہ تھیں۔ اس نے اپنے آپ کو ایسے پانچ مختلف مردوں کے حوالہ کردیا جن سے اسے کوئی محبت نہ تھی۔ اس نے وجوہات کا تجزیہ یوں کیا۔ "جنسی تعلقات کے بارے میں حصولِ معلومات — شراب نوشی — مرد کو

اپنے بس میں رکھنے کی خواہش (دو مرتبہ) اور ایک مرتبہ) بے حد چاہت"۔ اس نے سوالات کے جواب سے اپنے آپ کو ایک قابلِ رحم ہستی کے روپ میں پیش کیا ایسی ہستی جو اس وسیع جہان میں راہ گم کردہ مسافر کی مانند ہو۔ جو ایسے مردوں سے آباد دنیا میں رہتی ہے جن کے دل میں اس کی نسائیت کا کوئی احترام نہیں۔ اسے اپنے موجودہ ماحول اور تصورات دونوں ہی سے عدم تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ وہ "اپنے بارے میں مردوں کی رائے سے خوفزدہ رہتی تھی" اسے ڈر تھا کہ "وہ اس کے بارے میں باتیں بنائیں گے"۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس نے خود میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ ایسی لڑکیوں کا گہرا مشاہدہ کرنے والے ایک نوجوان مرد کی رائے قابلِ غور ہے۔

"میں نے ایسی اخلاق باختہ لڑکیاں دیکھی ہیں جن میں خود اعتمادی کا فقدان ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے ان کا ضمیر انہیں کچوکے لگاتا ہو لیکن وہ خود کو سنوارنے کی کوشش نہیں کرتیں"۔

قبولِ عام کی قیمت

بعض اوقات احساس کمتری کے باعث لڑکیاں غیر دانشمندانہ راستے اختیار کرلیتی ہیں۔ ایک نوجوان لڑکی کی داستان ہمیں کسی اور کے منہ سے سننے کا اتفاق ہوا۔ وہ مختصر سے جسم والی تھی گھر سے خرچ کے لیے کافی رقم آتی تھی۔ اس کا باپ بہت بڑا آدمی تھا اس کی تانبے کی کان تھی۔ جب اس نے ایک مخلوط تعلیم والی یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو "ڈیٹ" کے لیے لڑکے اس کے آگے پیچھے پھرتے۔ اس کا جسم خوبصورت نہ تھا، چہرہ سے خشونت ٹپکتی تھی اور بھڑکیلے لباس کی شائق۔ اس لڑکی میں کوئی ایسی خصوصیت نہ تھی کہ لڑکے اسے اپنے ساتھ کہیں لے جانا پسند کرتے۔ پھر اس میں گھبراہٹ بھی تھی نہ ہی وہ روشن دماغ تھی بہر حال کئی لڑکے اسے ایک ایک دو دو مرتبہ اپنے ساتھ لے گئے لیکن جب دیکھا کہ بات نہیں بنتی تو آہستہ آہستہ اس کی مانگ ختم ہوتی گئی۔ اب اس کے سامنے دو راستے تھے یا تو وہ لڑکوں میں غیر مقبول ہوکر رہ جاتی ورنہ پھر ان کے تقاضے پورے کرے اور اس نے ان کے تقاضوں کو اس خوش اسلوبی سے پورا کیا کہ "وہ ڈیٹ" کے لیے جتنے مرد بھی چاہتی اسے اتنے ہی مل سکتے۔ ہوسکتا ہے وسیع کنبہ میں اپنی بدصورتی کے باعث وہ اب خوش باشی سے وقت گزارنے کی متمنی ہو یا والدین اور سکول کے ساتھیوں سے توجہ ملی ہو۔ انا کی تسکین کے لیے ناکافی۔

ایک اور لڑکی نے دو سال کے عرصہ میں بیس مختلف مردوں سے جنسی تعلقات استوار کرنے کا دعویٰ کیا اس کا باپ انشورنس کمپنی میں ملازم تھا والدین کی ازدواجی زندگی کامیاب اور پُرمسرت تھی لیکن وہ مذہب کے باعث "جنس پر گفتگو سے گریز کرتے تھے"۔ اٹھارہ سال کی عمر میں پہلا جنسی تجربہ حاصل کیا اور اس کے بعد اگر "وہ بوسہ بازی سے آگے بڑھ جاتی" تو تعلقات ہمیشہ کچھ ضرورت سے زیادہ بے تکلفانہ نوعیت اختیار کرلیتے۔ یہ اس کی عادت بن چکی تھی۔ یہ لڑکی جنسی اختلاط کی کثرت کے باعث اس گروہ میں سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ یہ ان تین لڑکیوں میں سے ایک تھی جنہوں نے استقاطِ حمل کا اعتراف کیا۔ گویا کثرتِ اختلاط باعث حمل بنی۔

حمل کا خطرہ

اس کا امکان ہے کہ بہت سی لڑکیوں نے استقاط حمل کے بارے میں سچ نہ بولا ہوگا۔ ٣٠ میں سے ٣ کا تناسب تھا۔ جو ١٩٢ جنسی تجربہ کار لڑکیوں میں سے ٩ کے حمل کے مقابلہ میں دگنا بنتا ہے۔ لیکن پھر بھی دادِ شباب دینے والی ان لڑکیوں سے زیادہ تناسب کی توقع بندھتی ہے۔ کیونکہ مانع حمل تدابیر کے معاملہ میں یہ سخت بے احتیاط واقع ہوئی ہیں اکثر نے اس کی ذمہ داری "مرد پر چھوڑ رکھی تھی" یا انہیں سرے سے ان "احتیاطی تدابیر کا علم ہی نہ تھا"۔ ایسے حالات میں حمل کا امکان نہیں بلکہ وہ اغلب ہوتا ہے۔ اگر ساتھ گھومنے والے لڑکوں کے ساتھ ان کے تعلقات زیادہ بے تکلفانہ ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ تو ضرور ہی اختلاط ہوتا ہوگا اور اس کا قوی امکان ہے کہ گردش حیض میں بار آوری کے لیے زرخیز ترین وقت کے بارے میں کوئی احتیاط نہ برتی گئی ہوگی گو انہوں نے اعتراف نہ کیا لیکن قیاس ہے کہ استقاطِ حمل پر ان کی نجی معلومات کم نہ ہوں گی یوں بھی یہ خیال تقویت پکڑ جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے احباب کے ایسے واقعات بکثرت گنوائے اس سے کم از کم اتنا تو ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ کالج کی اکثر طالبات کے مقابلہ میں وہ کہیں زیادہ واقفیت رکھتی ہیں۔

اتفاقی اختلاط

بعض اوقات اچھی تربیت، خود اعتمادی اور مناسب سماجی مقام کے باوجود بھی ایک لڑکی اتفاقی اختلاط کی مرتکب ہو جاتی ہے شراب کے نشے کی مستی یا پھر خصوصیت سے تجربہ کار مرد کے ہاتھ اسے کہیں سے کہیں پہنچا کر تمام حدود عبور کرا دیتے ہیں۔ وہ اس وقت سب کچھ کر گزرتی ہے لیکن بعد میں زبان بند رکھتی ہیں۔ کئی نوجوان مردوں نے ایسے واقعات سنائے لیکن ایک لڑکی نے بھی کسی ایسے واقعہ کا تذکرہ نہ کیا لڑکوں کے خیال میں لڑکی بعد میں احساس جرم کے باعث ایسے واقعات جلد سے جلد فراموش کرنے کی خواہاں ہوتی ہے۔ لیکن خوش وقتی کی قائل لڑکیاں لڑکوں سے مسلسل ملتی اور سب کچھ سہتیں۔ ایسی ہی ایک لڑکی نے بتایا "اگر لڑکوں سے مسلسل ملتے رہیں تو جلد ہی تمام حدود عبور کرنے والا وقت آجاتا ہے۔ اور پھر اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے؟"

جنسی اختلاط کو ہلکے پھلکے انداز سے لینے والی ایک اور لڑکی نے اپنے مخصوص نظریہ سے اس امر کی یوں وضاحت کی۔

"یہ تو قوتِ ارادی کا مقابلہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے دام میں الجھانے کی کوشش کرتا ہے اور تم یہ دیکھتی ہو کہ تم کس حد تک جانے کے بعد بھی رک سکتی ہو اور کبھی اس کی جیت ہو جاتی ہے"۔

شراب کے اثرات

زیادہ شراب نوشی کا لازمی نتیجہ لاپرواہی اور عدم احتیاط ہوتا ہے اب یہ دوسری بات ہے کہ یہ دونوں شخصیت کی خامیوں کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ ایک سرکاری ملازم اور مذہبی ماں کی اکیس سالہ بیٹی لے جن کے گھر میں جنس کا نام لینا بھی حرام تھا۔ لکھا کہ ہائی سکول میں تعلیم کے دوران ایک موقعہ پر اس نے "تھوڑی سی پی" لی۔ اس کی حالت سے فائدہ اٹھا کر ایک لڑکے نے اس کے ساتھ "زنا بالجبر" کیا۔ اس کے دل میں لڑکے کے خلاف شدید نفرت بیٹھ گئی اور اس نے دوبارہ اس کی صورت تک بھی دیکھنے سے انکار کر دیا اس واقعہ پر کم از کم نصف سال تک وہ ناخوش اور ملول رہی۔ لیکن اس کے باوجود بھی محافل مے نوشی کے طفیل وہ ایسے ہی مزید چار تکلیف دہ واقعات سے دوچار ہوئی۔ اب اس کے ذہن میں "اختلاط کی نفسیاتی احتیاج کے بارے میں شدید شکوک" پیدا ہو چکے تھے۔ اس نے اس امر کا اعتراف کیا کہ شراب کا نشہ "پہلے سے جذباتی طبیعت" کے لیے دوآتشہ کا کام کرتے جذباتی بحران کا شکار بنا دیتا ہے اس گروہ سے تعلق رکھنے والی اکثر لڑکیوں کے برعکس اس میں اپنے جنسی تعلقات کا پیدا کردہ مجرمانہ انجماد بھی ملتا تھا۔ ویسے اس کے نزدیک جنسی تعلقات "ہیجانی تناؤ سے چھٹکارا پانے کے لیے کم و بیش ضروری بھی ہوتے ہیں" یہ ایک ایسی لڑکی کی مثال ہے جو خود کو بے سہارا سمجھتے ہوئے ابھی زندگی میں اپنے مقام کی متلاشی

تھی۔ اسے توقع تھی کہ وہ شادی کی صورت میں تسکین وہ جسمانی تعلقات کے ساتھ ساتھ ہیجانی تحفظ بھی پالے گی۔ اسے بچوں کی "بہت زیادہ" خواہش تھی۔

اس گروہ میں قوی شخصیت کی حامل ایسی لڑکیاں بھی ملتی ہیں۔

جنسی مقاومت

جنہوں نے جنسی جنگ چھیڑ رکھی تھی اور یہ اپنے خام انداز میں گویا روسی مسلکہ کیتھرائن اور جنسی لحاظ سے قوی ان تاریخی خواتین کی روایات تازہ کرنے میں مصروف تھیں۔ جنہوں نے ایک نظریہ کی رد سے مردوں کو اسی لیے نشانۂ انتقام بنایا کہ وہ معاشرہ میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے ایسی لڑکیوں کو جنس مخالف کے افراد سے شعوری یا تحت الشعوری شکایات ہوتی ہیں۔ اس لڑکی کی مثال ملاحظہ ہو۔ یہ عین آخری مرحلہ پر اس لیے انکار کر دیتی کہ ایک تو یہ انا کی تسکین کا ذریعہ تھا۔ یعنی وہ خود کو "متوازن عیش پرست" تصور کرتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مرد "اس کے لیے التجا کرتا تھا"۔ اس کے والدین ہر وقت لڑتے رہتے تھے اور اس کی والدہ کے شدید احتجاج کے باوجود بھی اس کے باپ نے طلاق لے لی تھی۔

مگر دوسری لڑکی کا گھریلو ماحول اس کے برعکس خوشگوار تھا۔ اس ذہین لڑکی کے والدین ملنسار اور محبت کرنے والے تھے لڑکی کے بقول دو مردوں نے اسے "ذلیل کن انداز سے ٹھکرایا" تھا۔ اس مقصد کے لیے دو ہی کافی تھے۔ پہلے نے روایت پرستی کا سہارا لے کر میری دوستی کی کوشش کی "جب کہ مطلب براری کے بعد دوسرے نے ادھر کا رخ بھی نہ کیا"۔ نتیجہ میں بعد کے آنے والے تمام مردوں نے اپنے پیشروں کے گناہوں کا کفارہ ادا کیا۔ کیونکہ اب لڑکی یہ تہیہ کر چکی تھی کہ "چغد بننے سے چغد بنانا زیادہ بہتر ہے"۔ وہ عموماً مردوں کے ساتھ راتیں بسر کرتی انہیں اختلاط کے تمام مراحل طے کرنے دیتی صرف آخری مرحلہ تک نہ پہنچنے دیتی کیونکہ اسی موقع پر — اس نے زہر خند کرتے ہوئے وضاحت کی — وہ اس کے کان میں تمام نشہ ہرن کرنے والا طلسمی لفظ "باکرہ" پھونک دیتی اور اسی سے مرد کا کام تمام ہو جاتا۔ اس صورت میں ہم تمام ابتدائی گھریلو ماحول کے برعکس غالباً مرد کے عورت سے غیر انسانی سلوک کو اسی طرز عمل یعنی جنس مخالف کے لیے آزاد پسندانہ رویہ کا باعث ٹھہرا سکتے ہیں۔

ایک اور لڑکی نے اس امر کو اپنے لیے موجب فخر قرار دیا کہ وہ جب تک چاہے صورت حالات کو بے قابو نہیں ہونے دیتی۔ اس نے اٹھارہ سال کی عمر میں حصول تجربات کے لیے یہ سلسلہ شروع کیا اور دو سال کے اندر چھ مردوں سے جنسی تعلقات استوار کیے اگر من پسند مرد نہ مل سکا تو کم از کم وقت اس کا اپنا پسندیدہ ہوتا تھا وہ اس سلسلہ میں رقمطراز ہے۔

"اس حقیقت کو تسلیم کرنا تکلیف دہ ہوتا ہے کہ ہم سبھی حیوان ہیں تاہم اگر من کی موج اور معقول لڑکا ہو تو میں سوچتی ہوں اب کیوں نہیں؟ میرے کچھ کرنے کا اپنے موڈ اور مرد کی وجاہت پر انحصار ہوتا ہے اگر مجھے اچھا کردار ظاہر کرنا ہو یا مرد کی دلچسپی کی برقراری مقصود ہو۔ تو میں خود پر قابو رکھتی ہوں۔ پھر میں نہ تو زیادہ شراب پیتی ہوں اور نہ ہی معاملہ آگے بڑھنے دیتی ہوں"۔

غالباً اس لڑکی کی زندگی میں ایسا کوئی لائحہ عمل نہ تھا جس کے لیے یہ اپنی تمام قوت ارادی بروئے کار لا سکتی۔

نفسی تجزیہ

جام شباب لنڈھانے والیوں کے لیے جام شراب کی بدمستی بہت بڑا سہارا ہوتی ہے لیکن یہ کہنا بالکل احمقانہ ہوگا کہ شراب سے پرہیز کی صورت میں یہ زندگی اور اس کے صحیح تقاضوں سے بجا طور سے ہم آہنگ ہونگی۔ مردوں اور عورتوں میں کثرت مے نوشی کے کچھ نفسیاتی اسباب ہوتے ہیں۔ یہ بالکل اس طرح ہے جیسے ہم مختلف لڑکیوں کے جنسی طرز عمل کو ماضی کے واقعات کی روشنی میں سمجھ سکتے ہیں۔ کچھ لڑکیاں کسی طرح کے امتیاز و انتخاب کے قابل نہیں جب کہ بعض دوسرں کو ستا کر لطف اندوز ہوتی ہیں اور پھر کچھ ایسی بھی ہیں جو اخلاقی لحاظ سے ایک طرح کی خودکشی کر بیٹھتی ہیں۔

دو گہری سہیلیوں اور ذہین لڑکیوں نے بڑے بے رحمانہ طریقہ سے اپنا تجزیہ کیا: "ب" کے خیال میں "جنس پر تعفن ہونے کے ساتھ قابل نفرت و حقارت بھی ہے" اس کا باپ ایک کاروباری آدمی تھا جس نے گھر میں اخلاقی ضوابط نافذ کر رکھے تھے ادھر اس کی ماں ہر وقت خوش ذوقی کے معاشرے کے چکر میں الجھی رہتی۔ عنفوان شباب میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس نے اپنی عدم مقبولیت کا باعث اپنی "پاکیزگی" کو ٹھہرایا۔ جب سولہویں سالگرہ کے بعد لڑکوں نے اسے مرکز توجہ بنایا تو زیادہ سے زیادہ "ڈیٹوں" کی خاطر وہ انہیں کافی سے زیادہ مساس اور جسمانی بے تکلفی کی اجازت دے دیتی۔ بیس سال کی عمر میں اس نے اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ محض تجربہ کی خاطر اختلاط کیا لیکن اس کے ساتھ دوبارہ اعادہ نہ کیا گیا۔ اب تک وہ تین لڑکوں کے ساتھ اختلاط کر چکی تھی غالباً ان میں شراب نوشی کی محفلوں کا زیادہ ہاتھ تھا۔ ان کے علاوہ کئی مردوں سے نامکمل جنسی تعلقات بھی رہے۔

اس نے بتایا: "میں جسمانی بے تکلفی کے لحاظ سے اتنی مرتبہ اختلاط تک پہنچ چکی ہوں کہ مجھے تو اب اس کی کوئی آرزو ہی نہیں رہی ہاں! مجھے مساس اور پیار و محبت بہت اچھا لگتا ہے"۔ بسا اوقات وہ لڑکے کو آسودگی کے لیے آخری منزل تک پہنچ جانے کے بعد اختلاط سے باز رکھتی اس نے بتایا: "اس سے میں خود کو بہت اہم سی سمجھتی ہوں" اس کا قوی امکان ہے کہ مردوں کو اذیت دینے کی خواہش عنفوان شباب کے اس دور سے تعلق رکھتی ہے۔ جب وہ اس پر توجہ نہ دیتے تھے۔

اس میں ایک طرف تو مردوں کے ہاتھوں جسمانی اشتعال کی خواہش تھی اور دوسری طرف وہ اظہار نفرت بھی کرتی تھی۔ اس نے لکھا "اگر میں نے کبھی کسی ایسے مرد کو پالیا جو خوش مزاج اور دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ میرے لیے ہیمنز کا کام بھی کر سکے تو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی وفادار بن کر رہوں گی۔ جب تک وہ مرد نہیں ملتا میں اپنے اطوار نہ بدلوں گی۔ مجھی عزت نفس کی ضرورت نہیں۔ زیادہ سے زیادہ مفت کی شرابیں اڑاؤں گی۔ اور جب گفتگو کے لیے کوئی موضوع نہ رہے تو — کا رالفق!"

اس نے یہ حقیقت تسلیم کی کہ جب جنس محض وقت کٹی ہو، نفسیاتی خواہشات کی تسکین کا ایک ذریعہ بن کر رہ جائے۔ اور جنسی فریق کے انتخاب میں کسی قسم کا امتیاز روا نہ رکھا جائے تو دونوں فریقین "ادنیٰ ترین طرز عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں"۔ اسے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہ تھی۔ اسے احمق بھی قرار نہ دیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ بہت زیادہ ذہین تھی اس کا نصب العین مصنفہ بننا تھا۔ بچپن میں جنم لینے والی اس جنسی مقاومت کا علاج غالباً نفسی معالجہ ہی سے ہو سکتا ہے۔

"کیا میں نے تمہیں دہشت زدہ کر دیا"؟

"ب" کی ہمجولی "ک" کا بھی مصنفہ بننے کا ارادہ تھا اس کے لیے شراب اور مرد بوریت دور کرنے کی چیزیں تھیں۔ سوالنامہ کو اس نے ڈرامائی طریقہ سے اس سوال پر ختم کیا تھا: "کیا میں نے تمہیں دہشت زدہ کر دیا"؟

اس نے بتایا: "یہ حقیقت ہے کہ مجھے جنس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ البتہ خواہش شراب سے تیز ہوتی ہے اور شراب بوریت سے بھاگنے کا ذریعہ ہے۔"

اگر اس کی داستانِ حیات نے ہمیں دہشت زدہ نہ کیا تو کم از کم ہم اس کی حفاظت کے لیے ضرور فکرمند ہو گئیں۔ گو اس کا باپ ماہر زچگی تھا۔ پھر اس نے ابتداء سے ہی مانع حمل تدابیر اپنانے کی کوشش نہ کی۔ اس نے بیس سال کی عمر میں پہلی مرتبہ ایک پچیس سالہ مرد سے جنسی رابطہ قائم کیا۔ تقریباً ایک سال تک بڑے بھلے طریقہ سے اسی مرد سے وابستہ رہی جب وہ مناسب وقفہ کے بعد حاملہ ہوئی تو نہ تو اسے مرد کی پرواہ تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں وہ مرد بھی اس کی پرواہ نہ کر رہا تھا اس لیے اسے اپنی ذات کے بارے میں بھی احتیاط کی ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ اس نے تنہا اسقاطِ حمل کرایا اور ایسے خطرناک حالات میں کہ ان کی نزاکت کا شاید اسے کبھی احساس بھی نہ ہو سکا تھا۔

اس لڑکی نے جن خطرات کو مول لیا انہیں دیکھتے ہوئے یہ ستم ظریفی معلوم ہوتی ہے کہ اس نے یہ سب کچھ محض تجربہ کی خاطر کیا۔ یہ دکھ دینے والی بات ہے کہ جسمانی اتصال کے باوجود بھی دوسرے فریق کے لیے اس کے دل میں کسی قسم کے جذبات نہ تھے۔ اسی طرح اسقاطِ حمل والے دن نے بھی اس کے "ذہن پر انمٹ نقوش نہ چھوڑے تھے" نتیجہ یہ ہوا کہ مستقبل میں بھی اس نے ان خطرات سے بچنے کی سعی نہ کی۔ اس واقعہ کے بعد اس نے تین اور مردوں سے تعلقات استوار کیے اور "سکاچ کے نشہ میں مست ہوتے کے بعد جنسی اختلاط کے لیے اس کی طبیعت مچل مچل جاتی"۔ یہ مثال اس بنا پر اور بھی المناک ہے کہ وہ شادی اور اس کے بعد بچوں کی متمنی تھی۔ اس نے بتایا "بوسے سے لے کر عصمت باختہ ہونے تک کا عمل بہت دھیما اور سست رفتار ہوتا ہے اور جب بالآخر یہ عمل مکمل ہوتا ہے تو یہ ایک خوشگوار تحیر کے روپ میں سامنے آتا ہے" اس نے اختتام پر لکھا "اس دن کے بعد سے میں نے اپنی گفتگو میں جنس کے ذکر کے ساتھ "خوبصورت" کا لفظ کبھی نہ ملایا"۔

یہ ٹھیک ہے کہ جنسی تعلقات کے لیے شراب ایک بہانہ بنتی ہو لیکن دونوں ہی حقیقت میں فرار کے ذرائع تھے۔ بقول اس کے "بہت کم نوجوان مردوں" نے اسے "ذہنی لحاظ سے متاثر کیا تھا۔ اس لیے وہ ذہنی کو جسمانی کا مترادف سمجھنے پر مجبور رہی اور یہ اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک وہ کسی ایسے مرد سے نہ ملے جو حقیقی معنوں میں اس کے لیے سامان "تسکین" پہنچانے کا باعث بن سکے اسے اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے ابھی خود بھی راستے اور سمت کا اندازہ نہ تھا اس لیے وہ اپنی جنسی تحریک پر قابو نہ پا سکتی تھی۔ بیدار ہو جانے کے بعد اس کے لیے رکنا اور باز رہنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ لیکن باز نہ رہنے کی صورت میں جنسی فعل سے وابستہ تلخیاں بعد میں اس کے لیے باعث کشمکش بن کر اسے "دہشت زدہ" کر دیتیں۔

ایک معمہ بچی غالباً والدین کو بچوں کے بگاڑ میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے لیکن ہم یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں کہ اگر میری کا باپ درشت مزاج وکیل اور اس کی ماں اخلاقی معاملات پر کٹر اور رجعت پسند نہ ہوتی تو شاید میری کی زندگی آج کسی اور ڈگر پر گامزن نظر آتی۔ وہ اس گروہ سے تعلق رکھنے والی ان معدودے چند لڑکیوں میں سے تھی جنہیں "معمہ بچیاں" قرار دیا جا سکتا ہے وہ ایک ذہین لڑکی تھی اور ہم میں سے ایک ابھی تک اس کی جلتی ہوئی آنکھوں کو نہیں بھول سکتی وہ رات گئے تک ہم سے باتیں کرتی رہی اس نے ہمیں بتایا کہ کیسے وہ پرجوش تصوریت سے نکل کر مردہ مگر آزاد جنس کی دلدل میں آ پھنسی۔ وہ شروع سے ہی کتابوں کی رسیا تھی اور اسے ہرزہ سرائی کی قطعی عادت نہ تھی۔ جب اس نے کالج آنے سے پہلے تمام گرمیاں ایک ساحلی چٹان پر گزاریں تو اس کے والدین نے گھر سے بے دلی غیر حاضری پر چنداں تشویش کا اظہار نہ کیا انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ اس کی خلوتوں کی ساتھی جنس پر ایک مقبول مگر رومانی کتاب تھی۔

کتاب اور گرد و پیش اس کے تخیلات کے لیے مہمیز بن گئے۔ اسے اب بھی یہ یاد تھا کہ وہاں اس نے زندگی کے اس حسن کے دلکش مگر مبہم سے خواب دیکھے تھے جو ایک مرد اور ایک عورت مل کر دریافت کر سکتے ہیں۔ ان سرخوشانہ جذبات کے بعد یہ جذباتی لڑکی جب ایک مخلوط تعلیمی ادارہ میں داخل ہوئی تو وہ محبت کے اولین تجربہ کے لیے پختہ ہو چکی تھی۔ جس لڑکے کو اس نے دل دیا گو اس میں ایسی کوئی خاص خصوصیت نہ تھی لیکن یہ اسے اپنے خوابوں کا شہزادہ سمجھ بیٹھی۔ ماضی کے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ ان حالات میں ان کے تعلقات کا جنسی فعل پر منتج ہونا لازمی اور فطری تھا۔ لڑکا اس سے منگنی کے بارے میں بالکل سنجیدہ نہ تھا۔ ادھر اس کی ماں نے اسی خدشہ کی بنا پر اسے واپس گھر بلا لیا کہ یہ کسی کی محبت میں دیوانہ وار غرق ہو چکی ہے تو اس جدائی سے صرف میری ہی کا دل ٹوٹ سکا۔ اس نے لڑکے کو التجا بھرے خطوط لکھے کہ وہ چھٹیوں میں اس کے گھر آئے اور شادی کا وعدہ پورا کرے لیکن اس نے صاف لکھ دیا کہ کالج کی تعلیم کے دوران وہ کسی قسم کے بندھنوں میں خود کو جکڑنے کے لیے تیار نہیں۔

خوابوں کی اس شکست کے بعد اس کی زندگی تلخ ہو گئی۔ اپنے والدین کے لیے اس کے دل میں معاندانہ جذبات کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا "پاکیزگی" کی مبلغہ ماں کے ساتھ ہر وقت جنگ چھڑی رہتی نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ضد سے کام لیتے ہوئے ایک جگہ ملازمت اختیار کر لی۔ وہاں دفتر کے مالک نے گھٹیا ناولوں کے کسی کردار کی مانند اسے اپنی توجہ کا مرکز بنانا چاہا۔ گو وہ کراہت انگیز تھا لیکن بالآخر اسے تسخیر کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اس کی پہلی وجہ تو ملازمت کی برقراری تھی۔ لیکن بعد میں خواہشات کا شعلہ بھڑک اٹھنے پر وہ خود ہی بے بس ہو گئی۔ اس کے بعد سے اس کی زندگی کا المیہ شروع ہوتا ہے۔ حمل۔ ایک خطرناک اور مشکل اسقاطِ حمل ۔۔ ملازمت اور دفتر کے مالک کے ساتھ معاملہ کا ختم ہونا اور بعد ازاں کالج واپس آنے کے بعد تو وہ ان مردوں کی ایک رات کی دلہن بنتی رہی جو اس کے لیے جسمانی تناؤ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے ذرائع سے زیادہ اور کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے۔

انٹرویو کے وقت اس میں بے چینی اور یاسیت نمایاں تھی۔ ڈھنگ سے کام کرنے کے لیے اس کی جنسی خواہشات کی مستقل تسکین لازمی بن چکی تھی۔ اس لیے وہ آنکھیں بند کیے اس راستہ پر جا رہی تھی۔ گو وہ حمل سے بچنے کی خواہاں تھی۔ مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ اسے جنسی بیماری کا کوئی خوف نہ تھا۔ اس نے یہ تسلیم کیا کہ وہ جسمانی آسودگی کے ساتھ ساتھ محبت ورنہ کم از کم دوستی کی تو ضرور ہی خواہاں ہے لیکن اب بیس برس کی عمر میں وہ قنوطی اور تلخ مزاج بن چکی تھی۔

ہو سکتا ہے کہ میری کی جنسی اشتہا کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تیز ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ معاشرے کے اس عبوری دور کی شکار بھی تھی۔ بہت سے نوجوان افراد جنس کی گرم کرنے والی کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ان میں سے ایسے بہت ہی کم ہیں جو زیر مطالعہ نظریات کا ان معمر افراد کی گفتگو سے موازنہ کر سکیں جن کی باتیں مجرد اخلاقی نظریات کی بجائے تجربات کا نچوڑ ہوتی ہیں یہ ٹھیک ہے کہ دانشمند سے دانشمند مشیر بھی کسی نوجوان کو اس کے خوابوں کی شکست سے نہیں بچا سکتا لیکن اگر میری کو گھر میں اچھا ماحول ملا ہوتا اس نے

اپنی ذات کو مرکز نہ بنایا ہوتا تو شاید اس نے اپنا توازن یوں بری طرح سے خراب نہ کیا ہوتا۔

جب ایک تخیل پرست اور حساس لڑکی کے خواب جھوٹے ثابت ہوں تو اس کی پسند ناپسند کے معائیر تبدیل ہو جاتے ہیں اور وہ زندگی کی بنیادوں کو متزلزل محسوس کرتی ہے۔

ہم نے ایک اور کالج میں ایک لڑکی کی داستان بھی سنی جس نے اپنی ہم جولیوں کے بقول ایک ناکام محبت کی۔ ناکامئ الفت کے بعد وہ دو سال تک آزاد جنسی لبسر کرتی رہی اور پھر ایک دن اس نے کوٹھے سے چھلانگ لگا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

جنس بطور معاوضہ

مستقل جنسی تجربات مستقل خواہشات کا روپ دھار لیتے ہیں۔ دادِ شباب دینے والی تیس لڑکیوں میں سے نصف سے زائد نے ایسی بے تاب خواہش کا وجود تسلیم کیا۔ لیکن جنسی صراطِ مستقیم سے منحرف یہ لڑکیاں صرف جنسی خواہشات کی شوریدہ سری سے ہی مجبور نہ تھیں کیونکہ ذہن پر نسلی اثرات کا مطالعہ کرنے والے ماہرین کے خیال میں ان کا طرزِ عمل عدم مطابقت ہی کا ایک انداز ہے۔ بلینچرڈ اور مینسر اپنی کتاب NEW GIRLS FOR OLD میں رقمطراز ہیں "معاشرہ اور اپنے والدین کے خلاف جنس کی بنا پر نبرد آزما ہونے والی لاتعداد لڑکیوں کے تقابلی مطالعہ میں ایک عنصر مشترک پایا گیا کہ ان کا آزاد جنسی طرزِ عمل صرف جنسی تناؤ سے جسمانی تسکین کا ایک وسیلہ نہ تھا بلکہ یہ ہیجانی آسودگی کا بھی ایک انداز ہوتا ہے ۔۔۔۔ زندگی کے ابتدائی سالوں میں عدم تحفظ اور ہیجانی عدم تسکین والے بچے کے لیے بعد میں ہیجانی توازن کا حصول ناممکنات میں سے ہوتا ہے"۔ (ص : ۱۸،۵۷)

آزاد جنسی زندگی بسر کرنے والوں کے طرزِ عمل کی اساس ناقابلِ برداشت جنسی تحریک نہیں بلکہ رشتہ الفت کے لیے مناسب معائیر کا فقدان ہے۔ بقول فلائیڈ ڈیل "جنسِ مخالف کے تمام خوش شکل افراد کے لیے مساوی شہوانی ردِ عمل کا یہ مطلب ہے کہ یا تو وہ بالغانہ مخالف جنیت کے تقاضوں سے عہدہ برا نہیں ہو سکتیں۔ ورنہ پھر وہ ان معائیر سے رجعت اختیار کرتی ہیں۔"

جہاں تک مقصودِ حیات کا تعلق ہے تو یہ لڑکیاں اپنی نسل سے جدا نہ تھیں ان تیس میں سے صرف تین نے شادی نہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا جب کہ باقی سب شادی اور بچوں کی خواہشمند تھیں۔ اس مقصد کے باوجود بھی انہوں نے اپنی زندگیوں میں جو بد نظمی پیدا کر رکھی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ ہر وقت جنسی بیماری یا اسقاطِ حمل کے خطرات سے دوچار رہتی تھیں اس کے ساتھ ہی عدم مطابقت کی پیدا کردہ الجھنیں اور پیچیدگیاں بھی تھیں۔ ان سب کا یہ مطلب ہے کہ ان کی تعلیم یا گھریلو ماحول میں مخصوص نوعیت کی کچھ خامیوں نے انہیں اس حال تک پہنچا دیا۔

مارگریٹ میڈ

انسانی زندگی اور جنس کی بدلتی اقدار

بعض اوقات لوگ "جنسی مسئلہ" کا اسی لہجہ میں تذکرہ کرتے ہیں جس میں وہ "مسئلہ محنت" کا ذکر کرتے ہیں گویا یہ بھی ایک نئی قسم کی وبال جان اور ناگوار چیز ہے جسے عہد جدید کے کارخانوں یا طیاروں نے جنم دیا ہو۔ ان کے لہجہ اور بات کے اس انداز کے پس پردہ یہ مفروضہ کارفرما نظر آتا ہے کہ ان کے دادا پردادا کے زمانہ میں یا ازمنہ وسطیٰ اور اگر ممکن ہو تو قدیم عہد حجر میں جنس ایسے کسی مسئلہ کا وجود نہ تھا۔ اس وقت ہر انسان کی نشوونما اور مباشرت معاشرہ اور اس کے ضوابط کی تابع ہوتی تھی۔ اس کے برعکس جدید المنان کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے گویا اس پر جنس ایک پیر تسمہ پا کی مانند مسلط ہے۔ اسے صحیح وقت، صحیح تعداد اور صحیح جنسی رفیق کے انتخاب کا شعور نہیں۔ جب وہ لڑکپن میں تھا تو اس کی توجہ ان خواہشات کی طرف منعطف ہوتی رہی جن کی نوعیت کو کوئی نہ سمجھتا تھا۔ ابھی آغازِ شباب ہی تھا کہ وہ شادی کے بندھن میں جکڑا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادھیڑ عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ یا تو "ٹھنڈا گوشت" بن جاتا ہے اور یا پھر نامکمل اور ناکام قسم کی جنسی بے وفائیوں کو شعار بنا لیتا ہے۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ جنس اپنے صحیح مقام پر ہی اچھی لگتی ہے جب کہ یہ ہمیشہ ہی غلط مقام پر پائی دیکھی جاتی ہے۔ واضح رہے کہ ان عیب جو نقادوں کے نزدیک جنس سے خالص جنسی فعل مراد ہوتا ہے اسی لیے تو امریکہ میں ہم لوگ مباشرت کے انداز کے بارے میں جملہ تفصیلات کو "حقائقِ زیست" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ہم یہ فراموش کر بیٹھے ہیں کہ انسانی جنسی طرزِ عمل کی بنیادیں کتنی گہری اور اس کی حدود کس قدر وسعت رکھتی ہیں حالانکہ انسانی زندگی ۔۔ مہد سے لحد تک اسی رنگ میں رنگی نظر آتی ہے۔ مکانات کا طرزِ تعمیر سکولوں کے لیے ٹیکسوں کی شرح، نظامِ افواج اور معبد گاہوں کے سلسلے ۔۔ سبھی کچھ اس زمرہ میں آ جاتا ہے۔ جنس کو اس مفہوم میں لینے سے یہ انسانی زندگی کا خام مواد ثابت ہوتی ہے۔ یہ دراصل وہ حیاتیاتی ترکیب ہے جس کے ذریعہ اعلیٰ درجہ کے تمام حیوانی اجسام میں بوقلمونی اور گوناگونی پیدا کرتے ہوئے نوع اور نسل کو مثبت انداز سے بہتر اور ارفع بنایا جاتا ہے یہی وہ حیاتیاتی گھر ہے جس سے والدین اس وقت تک علیحدہ نہیں ہو پاتے۔ جب تک خود ان کی اولاد نشوونما پا کر مکمل اور پیچیدہ جسم کی حامل نہیں بن جاتی۔

اگر ہم یہ کہیں کہ جب مرد زمین میں ہل چلاتا ہے بیج بکھیرتا ہے اور فصل کی کٹائی کرتا ہے تو وہ دنیا میں اپنے جنسی کردار کی ادائیگی کر رہا ہوتا ہے وہ جب کھیلتا ہے۔ تیرتا ہے۔ پہاڑوں کی ڈھلانوں پر برف پر پھسلنے کا کھیل "سکی" (SKI) کھیلتا ہے یا ان کی چوٹیوں کو سر کرتا ہے۔ وہ رقص کرتا ہے نغمہ گر کا روپ دھارتا ہے اور کار چلاتا ہے تو یہ بھی اسی جنسی کردار کی ادائیگی کا ایک حصہ ہیں۔ جب وہ لڑکیوں کے ساتھ خوش خلقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتا ہے وہ کسی رفیقہ حیات کا انتخاب کرنے کے بعد اسے حاصل کر لیتا ہے اور پھر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ رکھتا ہے تو وہ ایک بامراد عاشق سمجھا جاتا ہے ۔۔ زندگی کے ان تمام متنوع مظاہر کا جائزہ لینے پر واضح ہو جائے گا کہ جنس تمام زندگی پر محیط ہے یہ مرد کو مائل کارکردگی کرتی ہے اور پھر اس کارکردگی کے اختتام پر لازماً وقوع پذیر ہو کر ان مخصوص افعال کا باعث بنتی ہے جنہیں ہم رواجاً جنس سے موسوم کرتے آئے ہیں۔ جب مرد ۔۔ بچوں اور عورتوں سے علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں بلکہ بعض صورتوں میں ۔۔ جیسے ملاح، راہب اور تارک الدنیا ۔۔ تو دنیا اور انسانوں سے بھی منہ موڑ لیا جاتا ہے۔ دنیا سے یہ فرار اور اپنی ذات سے یہ گریز، ہی اس امر کی دلیل ہے کہ انہوں نے ایسے جہان میں جنم لیا۔ جس کا محور ہی جنس ہے اگر دنیا میں کوئی بھی شادی نہ کرتا تو تجرد، کنوارپن ناکتخدائی محض بے معنی الفاظ ہوتے۔

گو زندگی کے تار پود میں جنس کی اہمیت اور اس کے نفوذ کو بڑی وضاحت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ پیدائش، شادی اور والدین ۔۔ تعمیرات اور مصوری، کوہ پیمائی اور طیاروں کی پرواز ۔۔ وغیرہ کو مرد کے بنیادی کردار یعنی جنسی زندگی کے بالواسطہ یا بلاواسطہ اظہار کی مختلف اور متنوع صورتیں قرار دیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کے

مخالفین اس کے خلاف دو دلیلیں پیش کر سکتے ہیں۔ مخالفوں کے پہلے گروہ کا یہ کہنا ہے کہ بعض ـــ جیسے فرائڈ ـــ زندگی کے تمام مظاہر کو جنس کے خانہ میں بند کر دیتے ہیں۔ یہاں جنس سے ان کی مراد کنزے کے خیالات کے مطابق وہ جنسی کردار ہوتا ہے ـــ وہ مخصوص کردار جس سے جسمانی تناؤ کو آسودگی ملتی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ہر چیز کو جنس کے رنگ میں رنگ دینا غلط اور نا مناسب ہے کیونکہ محبت، شادی اور مذہب جنس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہیں ـــ اور یقیناً ایسا ہی ہے۔

نقادوں کی دوسری جماعت کا خیال ہے کہ جب اس سلسلہ میں سماجی، سیاسی اور فلسفیانہ مباحث کو برتا جاتا ہے تو ہم اساسی مسئلہ سے دور جا پڑتے ہیں سیدھا سادا بنیادی سوال ـــ جیسا کہ مذہبی عمارت میں منعقدہ ایک عام مجلس مذاکرہ میں ایک اٹھارہ سالہ نوجوان نے مجھ سے دریافت کیا تھا۔ محض امر و نہی کا ہے اس کا سوال بھی اس مسئلہ کو محدود معانی پہنا دیتا ہے کیونکہ درحقیقت وہ یہ جاننا چاہتا تھا! "میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کن حالات میں مجھے کس کے ساتھ جنسی طرز عمل اپنانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ مجھے اور کسی چیز سے کوئی سروکار نہیں"۔ اس کا سوال ان نوجوانوں کی جنسی ذہنیت کا غماز ہے جو ابھی تک محبت اور اس کی سحر کاریوں سے نا آشنا ہیں۔ ایسے نوجوانوں کے لیے یہ سوال اس وقت تک محض ذہن کے پس منظر میں رہتا ہے جب تک کہ محبت کے پھول مہک نہیں اٹھتے اس کے بعد ہی ان میں ایک لڑکی کو مستقلاً حاصل کرنے کی تمنا بیدار ہو کر انہیں زندگی کی ذمہ داریوں سے دوچار ہونے کا اہل بناتی ہے

اس کے برعکس پہلا اعتراض وہ مرد کرتا ہے جو یا تو تمام عمر محبت کی دلگداز کیفیات سے نا آشنا رہا یا پھر وہ اس سے اتنی دیر سے آشنا چلا آ رہا ہے کہ اب وہ یہ بھی فراموش کر بیٹھا ہے کہ محبت کس قسم کی ہوتی تھی۔ یہ وہ مرد ہے جو تمام عمر گزارنے کے باوجود بھی اپنی انفرادی تمناؤں کو جنس کے اولین تجربات کے ساتھ ہم آہنگ نہ کر سکا اور اب اسی لیے وہ یہ کسی طور سے بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ ان کے وہ "کارنامے" جو اس نے بحیثیت باپ، شوہر، ساہوکار یا مبلغ کے سرانجام دیئے تھے انہیں جنس کے محدود دائرہ میں بند کر دیا جائے کیونکہ اس کی اپنی یادداشت کے مطابق جنسی کردار تو محض چند غیر اطمینان بخش اور غیر مربوط قسم کے تجربات سے عبارت ہے۔

وہ لوگ جو اپنے جسم کے مخصوص تقاضوں کو اپنی عام زندگیوں کے ساتھ مربوط نہیں کر سکے اور یا وہ لوگ جو اس کوشش میں ناکام رہے ہیں۔ یہ سبھی اس عقیدہ کے حامل ہیں کہ "جنس محض ایک جسمانی فعل کا نام ہے" ایک گروہ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ جنس کا اعلیٰ اور ارفع چیزوں میں تذکرہ کرنے سے احتراز کرنا چاہیئے۔ جب کہ دوسرے گروہ کا دعویٰ ہے کہ اعلیٰ اور ارفع چیزوں کے تذکرہ کی صورت میں اصل مسئلہ (یعنی جنس) سے گریز نہ کرنا چاہیئے۔

اس ضمن میں جب ہم اس قسم کی باتیں "محض جنس" یا "جنس کے سوا کچھ بھی نہیں"، سنتے ہیں تو اس سے مسئلہ الجھ کر بعض متناقض صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ یہ باتیں بیسویں صدی کی زبان میں ہوں یا نہ ہوں اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا لیکن اتنا ضرور ہے کہ مرد جو خود کو ـــ ادھر کنواں ادھر کھائی ـــ والی حالت میں محسوس کرتا ہے تو اس کی اساسی وجہ یہی ہے۔ آج کا مرد اس ادھیڑ بن میں ہے کہ وہ کیسے اسی "محض جنس" سے کچھ اور بھی حاصل کرے۔ آج کے انسان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شجاعانہ کارناموں کے بعد، اعلیٰ شعری تخلیقات کے ہجوم میں اور دیگر عوامی کاموں کی انجام دہی کے سلسلہ میں جنسی لذت سے بہرہ ور ہونے والے احساسات جیسے کند ہو کر رہ جاتے ہیں۔ تہذیب کے اعلیٰ مدارج پر پہنچنے کے بعد اب وہ ان تمام افعال کو نظر حقارت سے دیکھنے پر مجبور ہے جو اس کے پہنائے گئے معانی کی صحیح تعبیر نہ پیش کر سکیں۔

یہ مسئلہ نیا نہیں بلکہ تہذیب کے اولیں مدارج سے ہی مرد اس چکر میں الجھا نظر آتا ہے۔ جب انسان بغیر کپڑوں کے جنگلوں میں خود کو گرم رکھنے کے لیے ہاتھوں میں لکڑیاں اٹھائے پھرتا تھا اس وقت سے ہی یہ انسانی معاشرہ کے سامنے یہ مسئلہ رہا کہ اگر انسان کی تحریکات کو کسی قسم کے نظم و ضبط کا پابند نہ بنایا گیا تو وہ عزیزوں کے ساتھ ساتھ اپنے کنبہ کے افراد کی محبت میں بھی گرفتار ہو سکتے ہیں۔ بلکہ افراد کنبہ کے ساتھ محبت کے امکانات زیادہ روشن تھے کیونکہ دن رات کا ساتھ، ایک دوسرے کی نگہداشت اور ایک ساتھ کھانا پینا ـ یہ بھی انہیں ایک بندھن میں جکڑ دیتے ہیں. واضح رہے کہ ہر انسانی معاشرہ میں اسی قسم کے بندھن میں جکڑا جانا معیوب اور ممنوع ہے۔ تحریم محرمات عالمی ہے! ایک کنبہ کو باپ بیٹے کی چپقلش، بھائی بہن کی محبت اور ماں بیٹی کی رقابت سے ہر لحاظ سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ ہر نسل کو بلوغت کے بعد اپنے کنبہ سے باہر جا کر جنسی رفیق کی تلاش کرنی ہوتی ہے اس سے معاشرہ میں پھیلاؤ اور وسعت پیدا ہوتی ہے ادھر معاملات الفت کی تکمیل میں تاخیر، تذبذب اور مشکلات وغیرہ بھی آ جاتی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اپنے دل کے قریب ہستیوں کے لیے جذبات الفت کو دبانا اور دوسروں کی بیٹیوں اور بہنوں کے دلوں تک رسائی حاصل کرنا بھی کچھ آسان نہیں۔ اس ضمن میں تاخیر بھی ہوتی ہے جو بعض اوقات طویل برسوں کو اپنے دامن میں لیے ہوتی ہے جیسے شمالی امریکہ کے میدانوں میں بسنے والے "انڈینز" میں ہوتا ہے یہاں کسی حسینہ کے طلب گار کو بعض اوقات برسوں اس کے بھائی کے ساتھ محتاط رہتے ہوئے شکار کھیلنا پڑتا۔ تب کہیں جا کر اسے اپنی محبوبہ سے بات کا موقع ملتا۔ اس تاخیر اور تذبذب کا نتیجہ دو صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے یا تو اتنی مشکل سے حاصل کی گئی بیوی شادی کے بعد مرد کی آرزوؤں کا تاج ثابت ہوتی ہے۔ اور اس کی معمولی سی سرگوشی بھی سرمدی نغمات سے کم کیف آور نہیں ثابت ہوتی ورنہ طویل فراق اسی جسمانی بے اعتنائی اور لاتعلقی کو جنم دے دیتا ہے جو بہت زیادہ رومانی طبیعت کا خاصہ ہوتی ہے۔

ان انڈینز کے ایک قبیلہ میں پہلے بچہ کی موت کی صورت میں طویل انتظار پر مبنی ایسی شادی ناکام ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بچہ کی موت کا غم شادی سے قبل کے طویل ذوق کی تلخی کے ساتھ مل کر ایک دوسرے پر الزام دہی کی صورت اختیار کر کے شادی کی مسرتوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داغدار کر جاتا ہے۔

تاریخ کے بعض ادوار یا بعض معاشروں میں اس مشکل کے حل کی صورت میں زندگی کے چکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ شباب کے کچّے دور میں جنسی تقاضوں کی تکمیل میں آزادی دیتے ہوئے فرد کو تمام ذمہ داریوں سے بالاتر رکھا گیا۔ لیکن شادی کے بعد باپ بننے پر اسے ایسی آزادی یا غیر ذمہ داری کا کوئی حق نہ رہتا تھا بلکہ اس وقت اس سے ہر قسم کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی توقع رکھی جاتی۔ جہاں زندگی کو دو حصوں میں نہ تقسیم کیا جاتا ـ وہاں عورتوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر لیا جاتا تھا۔ "بری عورتوں" کا "محض جنسی" مصرف ہوتا تھا جب کہ "اچھی عورتیں" بیوی اور ماں بننے کے قابل سمجھی جاتی تھیں ان "اچھی عورتوں" کے ساتھ عام جنسی تعلقات کی استواری ممنوع اور لاحاصل سمجھی جاتی تھی۔ یا پھر جنسی کردار کو زمان و مکان کا پابند بنا لیا جاتا تھا۔ مثلاً مرد اپنے علاقوں میں تو بڑے شریف اور محتاط

رہتے وہ کسی کی ماں بہن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ لیکن جب وہ دوسرے علاقوں میں مسافر، ملاح یا سپاہی بن کر جاتے تو شرافت کا جامہ اتار پھینکتے اور ہر طرح سے کھل کھیلتے۔

تاریخ کے ہر دور کے ہر معاشرہ میں (ہمارا پیچیدہ معاشرہ اس سے مستثنیٰ نہیں) عوام کے مختلف طبقات میں — جیسے کاشت کار اور شہری کارکن — لوگوں نے ایک جنسی توازن قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ میزان کے ایک پلڑے میں جنس پر مبنی وہ تقاضے ہیں جن کی بنا پر بادۂ الفت کے راہرو کو مشکلات درپیش آتی ہیں ان کے ساتھ ساتھ ہی ذمہ داریاں ولدیت، مذہب کے معاملات بھی ہیں۔ میزان کے دوسرے پلڑے میں وہ تمام تقاضے آجاتے ہیں جن کی وجہ سے سیدھی سادی جسمانی لذت خود کو گنوا بیٹھتی ہے۔ اس ضمن میں ہمیشہ مشکلات کے ہفت خواں ملتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ جب معاشرہ سب کی پابندی کے لیے قوانین و ضوابط وضع کرتا ہے تو یہ فراموش کر دیا جاتا ہے کہ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است کے مصداق انسان انسان سے نہیں ملتا خصوصاً جنسی کردار کے معاملہ میں تو تنوع ہی تنوع ہے۔ جنسی لذت کے حصول کا وہ طریقہ جو ایک کے لیے صحت مند اور نارمل ہے دوسرے کے لیے سخت قسم کا جنسی اجتناب ثابت ہو۔ جب کہ تیسرے کے نزدیک جنون اور بہیمانہ زبردستی کے مترادف ہو۔ جہاں جنس کے بارے میں رازداری سے کام لیتے ہوئے اسے شرم اور ضبط کے لبادے تلے چھپا چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ وہاں جنسی کردار کے یہ اختلافی پہلو اجاگر نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ قریبی دوست اور بھائی بھی اس سے بے خبر رہتے ہیں اس لیے عورتوں کو اس کے بارے میں کچھ علم نہیں ہونے پاتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لڑکیاں اس کے بارے میں تصورات سے کام لیتے ہوئے طرح طرح کی خوش کن توقعات وابستہ کر بیٹھتی ہیں لیکن جب وہ حقیقت سے دوچار ہوتی ہیں تو جسمانی تعلقات کے معاملہ میں ذرا سی گرم جوشی کو وہ اپنی نسائیت کی توہین سمجھتی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں وہ لڑکیاں بھی ہیں جن کی توقعات کچھ اور طرح کی ہوں گی اسی لیے وہ اس "ذرا سی گرم جوشی" کو سرد مزاجی اور فقدانِ جذبات پر محمول کریں گی۔ اکثر لوگ شبِ زفاف میں کی گئی باتوں کو لطیفوں کے طور سناتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ ایسے لطیفے اور واقعات ہر طرح کے معاشرہ میں — خواہ مردوں کے لیے زیادہ جنسی آزادی ہو یا نہ ہو — سنائے جاتے ہیں۔ ان لطیفوں کا ژرف نگاہی سے جائزہ لینے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لطیفے معاشرہ کے لگے بندھے ضوابط اور فرد کی جنسی طبیعت میں انفرادی رجحانات کے ٹکراؤ کی عکاسی کرتے ہیں، بعض مرد خواہشات میں ابھار پیدا کرنے کے لیے ایک خاص طرح کا ماحول پیدا کرتے ہیں جب کہ بعض بالکل اس کے الٹ رویہ کے حامی ہیں۔ تاہم بعض دیگر اختلافات کے ضمن میں معاشرہ — وہ معاشرہ جو والدین، احباب، بیویوں اور محبوباؤں سے تشکیل پاتا ہے — سب مردوں کو یکساں سمجھتا ہے۔ جب روایات اور رسوم مرد کی قوتِ مردانگی پر زور دیتے ہوئے اس سے تمام حالات میں ہی "محض جنسی" کام لینا چاہتے ہوں تو مردوں سے وحشیوں اور جانوروں ایسے سلوک کی توقع کرتے ہوئے انہیں اسی رنگ میں پیش کیا جاتا ہے لڑکیوں کو ان کے بارے میں باضابطہ طور سے آگاہ کیا جاتا ہے اور اس دنیا میں جہاں پابندیاں اور نگرانیاں ہیں پہلی رات کو چیخیں مارنے اور بے ہوش ہو جانے والی لڑکیاں ان مردوں کے ساتھ خوش رہتی ہیں جو اپنی طبعی ساخت یا اکتسابی صلاحیت کی وجہ سے جنسی طرزِ عمل میں نرے "بالغ" ثابت ہوتے ہیں جب کہ اس معیار پر پورے نہ اترنے والے مرد میدان چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

معاشرہ کی پیچیدگی کے ساتھ ساتھ ایک تیسرے عنصر کی کارفرمائیاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں یہ تیسرا عنصر ہے — خطرہ! ہر معاشرہ بلکہ ہر پیچیدہ معاشرہ کے ہر طبقہ میں ہمیشہ سے روائتی قسم کے بعض ایسے طریقے پائے جاتے ہیں جن کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر چھوٹے بچوں نے جنسی طرزِ عمل کے بارے میں حصولِ معلومات کرنا ہو تو وہ ان طریقوں کو اپنا وسیلہ بنائیں۔ اپنے جسم اور اس کے بعد صنفِ مخالف کے جسم سے آگاہی سے لے کر زن و شو اور ماں باپ کے باہمی تعلقات تک۔ ہر قسم کی معلومات کے لیے ان طریقوں کو مستند تصور کیا جاتا ہے۔ وہ ابھی بچے ہی ہوتے ہیں کہ اپنے کنبہ میں رہ کر یہ سیکھتے ہیں کہ انہیں کب روحانی بننا چاہیئے اور کب عملی۔ دماغی صلاحیتوں کے مقابلہ میں انسان کب اپنے اچھے نقوش سے جیتتا ہے اور وہ کونسا مرحلہ ہے جب ایک لڑکے کو یہ سوچنا چاہیئے کہ کیا اس لڑکی کو ترکہ میں کو کچھ زمین بھی ملتی ہے، کیا اسے کھانا پکانا آتا ہے اور کیا وہ پھٹی ہوئی جرابوں کی مرمت کر سکتی ہے وہ بچے جو اپنے والدین کے ساتھ ایک ہی کمرہ میں سوتے ہیں وہ بہت جلد اس "راز" کو پا لیتے ہیں کہ شادی شدہ لوگوں کا ایک دوسرے کے ساتھ کیسا طرزِ عمل ہونا چاہیئے جب کہ وہ بچے جو ایسے مشاہدات سے دور رکھے گئے ہوں انہیں اپنی بعد کی زندگی میں بہت کچھ سیکھنا ہوتا ہے۔ اسی طرح کے جنسی مشاہدات سے دور رہنے والے بچوں کا جنسی طرزِ عمل عورتوں کے بناؤ سنگھار اور ملبوسات کے زیرِ اثر رہتا ہے۔ ایسے لوگ جنسی لحاظ سے اعلیٰ اور بلند خاندانوں کی "خواتین" سے متاثر ہوں گے یا پھر اس کے برعکس یہ اس قسم کی "خواتین" میں اپنے لیے کسی قسم کی جنسی کشش نہیں محسوس کرتے۔

جب بچوں کی تربیت اور نشو و نما اس نقطۂ نظر سے کی جائے کہ وہ بڑے ہو کر اپنے مخصوص سماجی حلقوں میں اپنے جنسی کردار کی ادائیگی بطریق احسن سرانجام دے سکیں۔ تو اس کے لیے اچھے خاصے اہتمام بلکہ دردسری کی ضرورت ہوتی ہے اس سلسلہ میں کئی لوگوں کے کردار اہمیت کے مالک ہیں مثلاً والدین کا بقیدِ حیات ہونا۔ دادی کی موجودگی اس لیے ضروری ہے کہ جب ماں دوسرے بچہ کو جنم دے تو پہلا دادی اماں کے ساتھ سوئے۔ اگر اناؤں کی ضرورت ہو تو وہ بھی اسی زمرہ میں آجاتی ہیں۔ دروازے، پردے اور لیمپ وغیرہ ہر چیز کا مخصوص مواقع کے تحت مخصوص جگہ پر ہونا اس لیے لازمی ہے کہ بچے صرف وہی دیکھیں اور سنیں جو ان کے لیے مناسب ہو۔ غلط مشاہدات اور غلط باتوں کا سننا بے سود ہوتا ہے اگر اس طرح کا منصوبہ پوری طرح سے پایۂ تکمیل کو پہنچے تو یہ بے حد افادہ بخش ثابت ہوتا ہے۔ بچوں کی اٹھان کچھ ایسے انداز سے ہوتی ہے کہ انہیں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ جسمانی قوا کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ جنسی معاملات کے بارے میں ان میں ذہنی کشادگی بھی پیدا ہوتی جا رہی ہے "شریف لوگ" یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے لیے صرف "معزز خواتین" ہی ٹھیک رہیں گی جب کہ ایک کسان ایک ایسی موٹی تازی لڑکی کے ساتھ شادی کرتا ہے جو تمام دن کھیتوں پر اس کا ہاتھ بٹانے کے بعد رات کو خود میں اسے جنسی آسودگی دینے کی سکت پاتی ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت لازمی ہے کہ سیدھے سادے معاشرہ میں بھی ایسی تربیت اور نشو و نما طے شدہ منصوبہ کے مطابق کبھی بھی تکمیل نہیں پا سکتی والدین مر جاتے ہیں، اور جب بچے پلنے کے لیے دادا کے گھر آتے ہیں تو وہ خود اتنے سال خوردہ ہو چکے ہوتے ہیں کہ بچوں کے لیے وہ ایک معیاری صورت نہیں اختیار کر سکتے یا اگر ایسا نہ بھی ہو تو بعض اور حالات کے باعث وہ تربیت کے اس منصوبہ بندی کا جزوی تکمیل کر سکتے ہیں۔ ایک مرد بیوی کی طویل اور شدید بیماری کے باعث اپنے بچوں کی تربیت جس ڈھنگ

سے کرتا ہے وہ عام مردوں کے بس کا روگ نہ ہو ، نتیجہ لڑکے یا لڑکی کی نشوونما کے متوقع انداز کی خرابی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے بعض اوقات پاگل افراد — جنہیں آج ہم جنسی مجرم کہتے ہیں - بچوں پر مجرمانہ حملے کرتے ہیں یا کم ازکم اپنے طرز عمل سے انہیں خوفزدہ کر دیتے ہیں۔ بعض استثنائی حالات میں دور کے رشتہ دار تحریم محرمات کی حدود عبور کر کے مرد سالیوں یا عورتیں دیوروں سے جنسی تعلقات استوار کر لیتی ہیں۔ گو بعض معاشروں میں خادماؤں سے کم عمر لڑکوں کو جنسی معاملات سے متعارف کرانے کی توقع بھی رکھی جاتی ہے لیکن جہاں ایسا نہ ہو تو وہاں بھی والدین کے غیض وغضب اور نفرت وحقارت کی پرواہ کیے بغیر وہ نوجوان لڑکوں کو اپنی جنسی تسکین کے لیے ورغلا لیتی ہیں ہمارا (امریکی) تعلیمی نظام اس لحاظ سے محض جزوا کامیاب ہے کیونکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ لڑکے لڑکیاں پڑھائی لکھائی اور ریاضی میں مہارت کے ساتھ ساتھ ان سے زیادہ نازک اور پیچیدہ معلومات بھی حاصل کر لیں گی حالانکہ تعلیمی نظام میں بچوں کے انفرادی رجحانات ومیلانات اور خاندانوں کی انفرادیت ملحوظ نہیں رکھی جاتی اس کے ساتھ ہی والدین کی موت ، نئی شادی اور ان سے قدرے کم اہم مسائل مثلاً مہاجرین کی آمد، قحط ، جنگ اور بادوباراں کی تباہیوں سے پیدا شدہ حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بھی کسی قسم کی گنجائش نہیں ملتی ۔

کوئی معاشرہ ایسی تربیت کے لیے خواہ کتنے ہی جتن کیوں نہ کرے وہ افراد کو زندگی بسر کرنے کے لیے کبھی بھی صحیح کردار نہیں سکھا سکتا۔ یعنی انہیں یہ علم ہو کہ خواہش کے موقع پر صرف خواہش محسوس کرنی ہے اور اگر وہ خواہش نہ محسوس کرتے ہوں تو وہ کون سے ایسے مواقع ہیں جب انہیں شرم، حیا ، ناگواری یا لاتعلقی کا اظہار کرنا چاہیے۔ تربیت کی یہی خامی مجرم بچوں کے بارے میں فراہم کیے گئے اعداد وشمار سے واضح ہو جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ دیگر جرائم ، کثرت مے نوشی اور مختلف النوع ذہنی خرابیاں بھی اسی کی غماز ہیں جنسی وظائف کی مکمل ادائیگی کے لیے عدم یا ناقص تربیت ان تمام سماجی خرابیوں کی واحد باعث نہیں قرار دی جاسکتی کیونکہ اس کے علاوہ اور بھی کئی بواعث ملتے ہیں ۔ مثلاً دولت کی غلط تقسیم، اقتصادی بحران پولیس کے نظام میں خرابیاں اور سیاسی تعطل وغیرہ لیکن اس کے باوجود یہ بھی صحیح ہے کہ بعض مرد محض اس وجہ سے شرابی اور آوارہ گرد بنے۔ اسی وجہ سے جرائم کو اپنایا کہ انہیں تمام عمر یہ موقع ہی نہ ملا کہ محبوب ، دوست، خاوند باپ، خسر اور دادا بن کر بھی زندگی کو مسرور طریقہ سے بسر کیا جاسکتا ہے — اور ایک مرد کی زندگی کے یہ مختلف روپ اپنے نقوش کے لیے جنسیت سے رنگ مستعار لیتے ہیں ایسے لوگ جب محبوب بنتے ہیں تو یہ اپنی محبوبہ کو کسی قسم کی مسرت دیئے بغیر اس سے آسودگی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اپنی صنف سے دوستی کی صورت میں ان تعلقات میں جسمانی خواہشات کا بے حد دخل ہوتا ہے بلکہ یہ اس جسمانی خواہش کو اس انتہا تک لے جاتے ہیں جو معاشرہ میں صرف عورتوں سے مخصوص سمجھی جاتی ہے۔ خاوند بننے کی صورت میں یہ لوگ ایک ہی بیوی کے ساتھ زندگی گزارنے کی یکسانیت اور اکتاہٹ میں کسی قسم کا تنوع پیدا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے یا پھر اگر تنوع پیدا کرتے ہیں تو اسے وہ انتہائی صورت دے دیتے ہیں جو بیویوں کی سمجھ سے بالاتر ہونے کی وجہ سے ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہے ۔ غرض کہ عام طبعی صلاحیتوں اور جنسی قوت کے اظہار میں اختلافات کا ہزارہا طریقوں سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے ۔ ایک مخصوص طبقہ کے مرد یا لڑکے سے عمر کے ایک مخصوص دور میں ایک خاص طرز عمل کی توقع رکھی جاتی ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ اس کا طرز عمل کچھ اور ہی صورت اختیار کر جاتا ہے ۔

"صراطِ مستقیم" سے یہ انحراف اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ خود تاریخ — اور سماجی نظم وضبط کی قیمت انسان اور اس کے جذبات کی قربانی کی صورت میں ادا کی جاتی رہی ہے یہ قربانی صرف قدیم دیوتاؤں کی قربان گاہ پر سینکڑوں قیدیوں کے سر قلم کرنے یا میدانِ جنگ میں کشتوں کے پشتے لگانے تک ہی محدود نہیں بلکہ اس قربانی میں انسانی مسرت کی کومل کلیاں اور الفت وشفقت کے لطیف جذبات بھی شامل ہیں یہ وہی قربانی ہے جو اپنی بھینٹ میں انسان کی زخمی اور مجروح روح قبول کرتے ہوئے معاشرہ کو طوائف اور جنسی مجرم بخشتی ہے ۔

جنس پر مضامین بہت سے مصنفین کے ان تحقیقی کارناموں پر مبنی ہیں جو گذشتہ نصف صدی میں سپرد قلم کیے گئے ۔ ان کے مطالعہ سے مردوں اور عورتوں کو یہ پتہ چل سکتا ہے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے کیسے اپنی ذہانت اور سائنس کے نئے طریق ہائے کار کو بروئے کار لا کر معاشرہ سے عدم مطابقت پانے والے افراد کی تعداد کم کر سکتے ہیں ۔ اسی طرح عدم طمانیت بخش شادیوں ، نامردوں خبطیوں ، احمقوں ، اپنی ذات کے خول میں مقید رہنے والوں اور ہر نسل میں محبت کے بھوکوں کی تعداد میں کمی پیدا کی جاسکتی ہے جنس کے ان پیشرو قلم کاروں نے اپنی تحقیقات کے ضمن میں بعض ایسے حقائق سے نقاب کشائی کی جن کے لیے تخیلی ذہن کے ساتھ ساتھ جراءت کی بھی ضرورت تھی ۔ سب سے پہلے تو انہوں نے اس پابندی کو ختم کیا کہ کن مخصوص موضوعات کے بارے میں لکھا یا گفتگو کی جاسکتی ہے ان کا موقف یہ تھا کہ سب سے پہلے تو ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ انسانی زندگی کن عناصر سے ترکیب پاتی ہے۔ خوابوں اور خانتریوں کے ساتھ ساتھ ہی عام شعوری کردار کا مطالعہ کیا گیا۔ وہ عورت جو بیوہ ہو جاتی ہے یا جو تمام عمر بن بیاہی کسی کے پیار بھرے لمس کو ترستی رہتی ہے اس کے کرب کی کتنی تھاہ ہے یا عنفوانِ شباب کے دور سے گزرنے والے جب اپنی جسمانی تبدیلیوں اور تغیرات کی تہ کو نہیں پہنچ سکتے تو ان میں احساس جرم کیا کیا صورتیں اختیار کرتا ہے۔ جنسی زندگی کے یہی مظاہر تھے جن کے بارے میں ان ماہرین نے تحقیقات شروع کیں ۔ ان میں سے ہیولاک ایلس اور فرائڈ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں ہیولاک ایلس نے اپنی تمام عمر جنسی کردار کی تحقیقات میں صرف کر دی جب کہ فرائڈ نے ایک معالج کی حیثیت سے یہ دریافت کیا کہ اس کے پاس آنے والے مریضوں کی اکثر تکالیف کی بنیاد غیر تسلی بخش زندگی پر استوار تھی۔ "غیر تسلی بخش جنسی زندگی" میں کئی عوامل آ جاتے ہیں مثلاً جسمانی تقاضوں کی عدم تسکین ، شادی کی ذمہ داریوں سے فرار جنسی فریق کے ساتھ وفاداری یا زمی اور حلیمی کا برتاؤ وغیرہ۔ فرائڈ نے ان خرابیوں کا باعث عہد طفلی کے بعض ایسے ناخوشگوار واقعات اور حادثات کو گردانا جو بعد کی زندگی کے زیر اثر نمایاں صورت اختیار کر لیتے ہیں معاشرہ نے فرد کے انفرادی رجحانات اور سماجی ضوابط کے درمیان توازن قائم کرنے کی خاطر حجاب کا جو پردہ ڈال رکھا تھا اسے ان لوگوں نے چاک کر دیا اور یوں معاشرہ کے اس قاعدہ کو ختم کر دیا جس کی رو سے فرد مجبور کر دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے ذہنی رجحانات کی تکذیب کرتے ہوئے زندگی کو اس کے اصلی رنگ میں گزارنے کی بجائے سماجی ضوابط کے تحت بسر کرے ۔

جیسا کہ ہوتا آیا ہے ان خیالات ونظریات نے سماج اور اخلاق کے ٹھیکیداروں کو سیخ پا کر دیا اور ان کی ہر لحاظ سے پرزور مذمت کی گئی ۔ جنسی تحقیقات میں

اگلا مرحلہ تقریباً پون صدی کے بعد آتا ہے جب جنس کے بارے میں تحقیقات کرنے والوں کو اس ضمن میں "غازی" اور "مجاہد" بننے کی ضرورت نہ رہی۔ آہستہ آہستہ دنیا والے جنس کے بارے میں ان نئے خیالات کے عادی ہوتے گئے۔ فرائڈ کے نظریات جدید علاج کی تسلیم شدہ اساس سمجھے جانے لگے۔ خصوصاً ایسے مریضوں کے لیے جن کی جنس اور اس کی کارکردگی میں بنیادی قسم کی خامیاں موجود ہوں۔ ہیولاک ایلس کا یہ نظریہ افراد میں جنسی عدم مطابقت اور معاشرہ میں ظلم و تشدد کی ایک اہم وجہ لاعلمی اور جہالت ہے — بھی اکثریت نے تسلیم کر لیا ہے۔ بعض فلاحی اور عوامی اداروں نے جنسی تحقیقات کے لیے زرِ کثیر صرف کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ ہملٹن اور بعد ازاں کنزے ایسے ماہرین کی تحقیقات نمایاں مثال کی حیثیت رکھتی ہیں انہوں نے مردوں کے جنسی کردار کا وسیع بنیادوں پر جائزہ لینے سے یہ معلوم کیا کہ کون کون سے افعال ہیں جو ان سے سرزد ہو چکے ہیں یا وہ تمام عمر جنسی تسکین کے لیے کیا کیا کرتے رہے ہیں۔ آج جب ہم ماضی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں جنس کے بارے میں رائے عامہ میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے ایک زمانہ تھا جب فرائڈ کی ابتدائی تحریروں کی شدید ترین الفاظ میں مذمت کی جاتی تھی اور ہیولاک ایلس — شادی کے حسن اور تقدس کے پرجوش حامی ایلس نے زندگی بھر کے لیے رشتہ مناکحت پر زور دیا جس میں فریقین کے تمام جذبات کو تسکین حاصل ہو جس کے نتیجہ میں وہ ایک دوسرے کے ہر لحاظ سے وفادار رہیں — لیکن زندگی اور جنس کے حسن کے گیت گانے والے ایلس کی تحریروں کا اس دور میں صرف یہ مصرف تھا کہ شہوت پرست لڑکے — وہ لڑکے جن کے اذہان اپنے ماحول کی جھوٹی شرم اور جنسی تصنع کی بنا پر شہوانی خیالات کی آماجگاہ بنے ہوتے تھے۔ فرصت کے اوقات میں ان علمی تحریروں کو لذت اور "چسکے" کے لیے پڑھتے تھے۔ ان لڑکوں کا بھی کوئی قصور نہیں کیونکہ لاعلمی کے ہاتھوں وہ بچپن اور جوانی کے عبوری دور کے ذہنی تقاضوں سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے تھے۔

جنگ عظیم اوّل کے بعد معاشرہ میں طرز بود و ماند اور آداب وغیرہ میں جو انقلاب آیا ہم اس سے گزر آتے ہیں — جب لڑکیاں اپنے بال کٹواتی تھیں اور ان کے سکرٹ گھٹنوں سے اونچے جا پہنچتے تھے۔ ان کی مائیں اپنی بیٹیوں کی آزادی سے حسد مزید حسد نہ کر سکیں تو عمر رفتہ کو آواز دینے کے مترادف وہ بھی وقت کی رَو میں بہہ گئیں۔ ہم کساد بازاری کے اس دور سے بھی گزر آتے ہیں جب اقتصادی تباہ حالی کی بنا پر لوگوں نے شادیوں اور بچوں کی پیدائش کو معرض التوا میں ڈال دیا اس نے دانشوروں کے حلقوں میں ایک دوسرا روپ اختیار کیا اور جنسی اور نجی مسائل کا حل ملکی معیشت اور اقتصادی مسائل کے حل میں مضمر سمجھا جانے لگا۔ ہم جنگ عظیم ثانی سے بھی نکل آئے ہیں جب کم عمری میں شادی کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی اور پھر جنگ کے بعد کے حالات — جن کے تقاضوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کم عمری میں بھی زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کیے جائیں۔ جوہری توانائی کے اس دور میں جب کہ امن عالم کے امکانات کم سے کم ہیں تو آج نظریات و خیالات میں پھر تبدیلی پیدا ہو چکی ہے۔ دریں حالات آج کی نوجوان نسل جنگ عظیم کی مانند اب پھر کم عمری کی شادیوں اور ولدیت کی طرف مائل ہوتی جا رہی ہے۔

ان حالات کا جائزہ لینے پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سماجی لحاظ سے ہم میں اب ایک نئی مطابقت پیدا ہو چکی ہے۔ یہ سماجی مطابقت (امریکی) عورتوں کے لیے اس لحاظ سے زیادہ سود مند ہے کہ اب فرد اور اس کے کنبہ کے مستقبل کا انحصار جائیدادوں اور زمینوں پر نہیں بلکہ تنخواہوں اور پنشنوں پر سمجھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مخلوط تعلیم، لباس کے بارے میں مکمل آزادی اور شادی سے قبل معاشی خودکفیلی نے آج کی عورتوں کو ماضی کی نسبت زیادہ آزادی حاصل ہے اس آزادی کے باعث شادی سے قبل کے بعض ضوابط — شرم، خوف یا بزرگوں کی کڑی نگرانی — اب ختم ہو چکے ہیں۔ اس لیے آج کے نوجوان جنسی مطابقت کے ضمن میں تمام مسائل سے عہدہ برآ ہوتے وقت ہر طرح کی آزادی اور اعتماد سے کام لیتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا ہوتا ہے تو اس کے لیے جنسی تعلیم کی ضرورت ہے بلکہ آج کے حالات میں جتنی اس کی ضرورت ہے اور کسی چیز کی بھی نہیں۔

کیونکہ اب (مغربی) معاشرہ انتخاب — ایک مخصوص طبقہ میں سے جنسی فریق کے انتخاب کی مکمل آزادی بخشتا ہے اس لیے اب شادی سے قبل جنسی تعلقات کی استواری کے ساتھ ساتھ شادی کی یکسانیت سے اکتا کر اگر اپنے طبقہ میں کسی سے جنسی تعلقات پیدا کر لیے جائیں تو اس پر ناک بھوں نہیں چڑھائی جاتی۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ اب طوائف اور داشتہ کی اہمیت دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے آج کے دور کا یہ تقاضا ہے کہ نوجوان جوڑوں کو اتنی معلومات ضرور ہوں کہ وہ اپنے انتخاب میں ٹھوکر نہ کھائیں ان کا انتخاب عاقلانہ ہو کہ اب اس ضمن میں والدین کے دباؤ یا بڑے بوڑھوں اور دوست احباب کے مشورہ کی کوئی اہمیت نہیں رہی اور نہ ہی قانوناً ان تحریکات کو دبا کر انہیں مخصوص کردہ راستوں پر ڈالا جا سکتا ہے۔ اس لیے جنسی تعلیم اور معلومات اشد ضروری ہیں۔ اب جنس کو ان وسیع معانی میں استعمال کیا جاتا ہے جن میں فرد کی تمام شخصیت سما کر تمام زندگی میں حسن و قبح اور خیر و شر کے معیار کی صورت اختیار کر لیتی ہے اس کے ساتھ ساتھ ہی اس کے محدود پہلوؤں مثلاً — جنسی فعل اور اس سے وابستہ امکانات نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔

نوجوان کے لیے جنسی تعلیم کے افادہ پر اعتراضات کرنے والے لوگوں کی کمی نہیں اور کہنے والے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بالغ اور معمر لوگوں کو بھی جنس کے بارے میں کچھ سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ گزشتہ نسل کے نوجوان خاصے فائدہ میں تھے کہ ان کے والدین اپنی کم علمی کے باعث ان کے بیشتر افعال و حرکات کی صحیح جنسی نوعیت کے بارے میں اندھیرے میں رہتے تھے۔ ایسے افراد کی بھی کمی نہیں جو شرم و حیا کو عورت کا سب سے بڑا زیور سمجھتے ہیں (وہ عورت باحیا اور عصمت مآب سمجھی جاتی ہے۔ جو جسم کے اہم اور مخصوص اعضا کے نام بھی نہ جانتی ہو) اپنی بیوی کو شرم کے اس معیار پر پرکھنے والوں کے لیے دورِ جدید کی بے حجابی نے تو گویا تمام جنسی لطف کا خاتمہ کر دیا ہے۔ آج کے نوجوان کے لیے سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ کسی ذاتی اخلاقی معیار کے فقدان کی بنا پر وہ اپنے عہد کی روش اپنانے پر مجبور ہے اسی لیے بعض نوجوانوں کا واحد سہارا ان کی لاعلمی ہوتا ہے۔ اس لیے وہ حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھ سکتے۔ نوجوان افراد پر مشتمل وہ نسل جس نے ضوابط کی بنا پر نہیں۔ بلکہ دوسروں کی تقلید اور بھیڑ چال میں اپنی جنسی خواہشات کو زیادہ سے زیادہ دبایا — اب کنزے رپورٹ کی اشاعت کے بعد وہ خود کو بے سہارا محسوس کر رہے ہیں اسی طرح وہ بزرگ حضرات جو زمانہ کے رواج بلکہ فیشن کی وجہ سے جنس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ بے تکلفانہ گفتگو برداشت کرتے جا رہے ہیں اب کنزے رپورٹ کی اشاعت کے بعد ان پر ناگواری کی عجیب سی کیفیت مسلط ہے۔ اس رپورٹ نے ان کے طلسم خیال کو باطل قرار دے دیا کیونکہ کنزے کے بقول مرد

ایک بے حس قسم کا جوان ہے ۔ ایسا جوان جو زندگی کے دیگر تقاضوں سے منہ موڑ کر صرف اپنے طبقہ کے سماجی اور اقتصادی تقاضوں کی انجام دہی کرتا رہتا ہے جب اس کے اعصاب میں تناؤ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو اس کی عارضی سی تسکین کے لیے اتنا بے تاب ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے مقصودِ تسکین یا ذریعہ تسکین بالکل بے معنی سا بن کر رہ جاتا ہے ۔

جدید معاشرہ کے نقادوں میں سے بعض جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار سے ہراساں ہیں ۔ خصوصیت سے بچوں میں مجرمانہ رجحانات کا فروغ زیادہ پریشان کن ہے لیکن یہ نقاد حضرات عموماً یہ امر فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ نئے خیالات کا نفوذ اس حد تک نہیں ہوا کہ تمام معاشرہ میں ان کے اثرات سرایت کر جائیں بلکہ اساتذہ، مصنفین معالجین، سماجی کارکنوں کا ایک محدود سا حلقہ ان سے متاثر ہوا ہے اسی طرح ان نوجوانوں کی تعداد بھی نسبتاً کم ہے ۔ جنہوں نے ایسے ماحول میں تربیت حاصل کی ہو جہاں جنس کے بارے میں بے تکلفانہ اور غیر تصنع طرز عمل روا رکھا گیا ہو ۔ ویسے اب جنس کے بارے میں بے تکلفانہ اور غیر تصنع اندازِ نظر کو فروغ ملتا جا رہا ہے ۔ جدید معاشرہ کے یہ کرم بین جب بچوں کی کسی "نرسری" میں تعلیم کی جدید ترین تکنیک کا تجربہ دیکھتے ہیں تو دیگر تمام قدیم عوامل اور بچے کے گذشتہ حالات کو فراموش کر کے اس جدید ترین تکنیک کو بچہ میں مجرمانہ ذہنیت پیدا کرنے کا ذمہ دار تسلیم کر لیتے ہیں ۔ ان حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہم فرائڈ اور ہیولاک ایلس ایسے دور اندیش مفکروں کی آراء کو تسلیم کر لیں جنہوں نے بہت پہلے یہ محسوس کر لیا تھا کہ مغربی تہذیب اپنے عوام کو جس راستہ پر چلا رہی ہے اس کے نتیجہ میں سوائے ذاتی مسائل اور ذہنی انتشار کے اور کچھ بھی ہاتھ نہ آئے گا ۔ انہوں نے علم کی جو نئی مشعلیں پیدا کی تھیں گو اب انہوں نے ہماری راہنمائی شروع کر دی ہے لیکن درمیانی وقفہ میں بہت سی زندگیاں تباہ بھی ہو چکی ہیں ۔

کثیر امریکی نوجوانوں کی مانند آج ہر علاقہ کے نوجوان یہ پوچھ رہے ہیں کہ شادی کو مسرت کا سدا بہار تحفہ کیسے بنایا جائے ۔ ایسی شادی جس میں تسکین کے لیے طوائفوں اور دوسری عورتوں سے جنسی تعلقات کی ضرورت نہ محسوس ہو ۔ ان نوجوانوں کو کیونکہ کئی طرح کے تجربات کرنے کے لیے مواقع اور آزادی میسر ہے اس لیے اب یہ خود ہی اپنے لیے اقدار اور ضوابط بنا رہے ہیں ۔ ان سب کا نکتہ عروج اس مطالبہ میں ظاہر ہو رہا ہے کہ انہیں جلد شادی کر کے کم عمری میں ہی باپ بن جانا چاہیے ۔

اس سے قبل ایک شادی کو ختم ہونے سے کئی چیزیں بچاتی تھیں مثلاً مذہبی خوف ، سماجی مقام یا نوکری کا کھو دینا وغیرہ مگر اب حالات میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ شادی کے استحکام کے لیے اور وجوہات پیدا ہو چکی ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم نوجوان باپوں کی اپنے بچوں کے لیے محبت ہے ۔ اس سے پہلے شادی شدہ جوڑوں میں بعض اوقات مکان ، زمین ، ورثہ میں ملنے والی سماجی حیثیت اور عزت و مرتبہ وغیرہ قدرِ مشترک کام کرتی تھیں مگر اب جنگ عظیم ثانی کے بعد شادی کرنے والی نسل ان امور سے بے نیاز ہو کر حال کی مسرتوں سے باہمی لطف اندوزی کو زیادہ اہمیت دیتی ہے ۔

رابرٹ لاٹو ڈکنسن :

جنسی کردار کی صدرنگی

اگر انسانی زندگی میں فطری مناسبت رکھنے والے پیشے اور کامیاب شادی کو گہری آسودگیوں کا باعث مان لیں تو انسانی زندگی میں سب سے زیادہ عدم آسودگیاں بھی غلط پیشہ اور ناپسندیدہ مباشرت ہی کی پیدا کردہ ہوں گی موخرالذکر صورت تو فطرت کی عظیم ترین حیاتیاتی غلطیوں کی مرہون منت ہے ماضی بعید میں فطرت نے اس سیارہ کو انسانی وجود سے معمور کرنا تھا اس لیے اس نے زرخیزی میں اعلیٰ ترین معیار کی برقراری کے لیے انسانوں کو جنس سے وابستہ ہر نوع کے جذبات و احساسات اور انگیخت بخش دی ۔ اور اب ہم اس کا نتیجہ بھگت رہے ہیں ۔ سماجی اجازت نامہ کے حصول سے برسوں قبل ہی لازمی اور شدید قسم کے وظائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے یہی وہ وظائف ہیں جن کے اظہار کی متنوع صورتوں پر "فطرت کے خلاف جرم" کا قانونی لیبل چسپاں کیا جاتا ہے اگر ہم گریبان میں جھانک کر دیکھیں تو ہم میں سے نوے فیصد ان "جرائم" کے ارتکاب کی پاداش میں قابلِ تعزیر ٹھہرتے ہیں ۔

اس لیے اگر مسئلہ جنس ، خوف ، انکار اور اخفاء کے دائرہ میں محبوس رکھا جاتا ہے تو یہ امر تعجب خیز نہ ہونا چاہیے ۔ اس بنا پر باآسانی یہ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ جنس کے بارے میں اختیار کردہ خاموشی اور اخفاء کا بہ بانگ دہل پردہ چاک کرنے پر عوامی ردّ عمل اچھا خاصہ طوفانی ہو گا ۔ لیکن جب یہ اظہار علم کے مختلف شعبوں مثلاً نفسی معالجہ، اعداد و شمار اور علم الانسان کے ذریعہ کیا جائے تو لوگ خوش ہوتے ہیں ۔ کنزے رپورٹ کا چیلنج اس بنا پر اور بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ اس میں احاطہ کیے گئے مسائل سے وابستہ مخصوص مواد اور معلومات اس بے باکی سے کبھی بھی نہ پیش کی گئی تھیں اور مرکزی نقطہ اس کی حقیقت بیانی ہے ۔ اس رپورٹ کا مقصد اوائل طفلی سے بڑھاپے تک ہر طرح کے طرز عمل کی درستی ہے اس میں جائزہ لیے گئے مسائل کو ان تین عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ فقید المثال، ناگزیر اور عالمگیر — اور جدید دور میں یہ سبھی جنسی کارکردگی کو مشروط کر دینے والے عوامل ہیں ۔

علم کے کسی شعبہ میں بھی عہد آفرین تخلیق کے لیے اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ محنت اور پہل کرنے کا جذبہ بھی ہونا چاہیے لوگوں سے ان کی نجی زندگی اور مسائل کے بارے میں سوالات کے جوابات حاصل کرنے کے لیے بہت ہی زیادہ ہمدرد انسان اعتماد حاصل کر سکتا ہے ۔ ایسا انسان والدین ، پادری ، معالج ، ماہر نفسیات یا نفسی معالجہ کا ماہر بھی ہو سکتا ہے ۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ رپورٹ نے جن اہم علمی مسائل کی طرف توجہ کی ان کے متذکرہ شعبوں سے وابستہ تمیں ماہرین کو بطور مشیر رکھا گیا تو اس کی صداقت تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی ۔

موجودہ دور میں نسل یا کنبہ کے ثبات کی خاطر "فالتو جنس" کا ذخیرہ رکھنے کی عضویاتی غلطی کی اب کوئی ضرورت نہیں ۔ اگر ہم اوسط اعداد لیں تو ہمارے مردوں کی شادی کرنے کی عمر ۲۵ برس بنتی ہے اور اتنی ہی مدت وہ ازدواجی زندگی بسر کرتا ہے (جیسے کہ پہلے ہوتا تھا) چار بچوں کی پیدائش کے لیے ۲۵ مرتبہ جنسی اختلاط کافی ہو گا یہ اختلاط وقفہ حیض کے درمیانی عرصہ کے وقت ہو گا ۔ فالتو جنس خاوند کی اس ضرورت اور استعداد میں دیکھی جا سکتی ہے جس کے باعث وہ کم از کم ہفتہ میں تین مرتبہ تو ضرور ہی اس کا اخراج کرتا ہے گویا وہ اپنی پچیس سالہ ازدواجی زندگی میں پچیس ہزار مرتبہ اختلاط کرتا ہے ۔ یہ تعداد اس صورت میں ہوتی ہے کہ ہم حیض اور حمل کی پابندیوں — جن کی اب کوئی پرواہ نہیں کرتا — اور بڑھتی عمر کے ساتھ گھٹتی توانائی کو بھی ملحوظ رکھیں ۔

کنزے کی دریافتوں میں فالتو جنس کی پیدا کردہ مذہبی اور حیاتیاتی کشمکش کو سب

سے اہم قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ سولہ برس کی عمر تک مرد انزال کے اعتبار سے نقطۂ عروج پر ہوتا ہے یہ کیفیت بیس برس تک جاری رہتی ہے اور پھر اس کے بعد ساٹھ سال تک اس میں مسلسل تقلیل ہوتی جاتی ہے۔ ایک انتہا پر روزانہ ایک سے زیادہ دفعہ بھی ممکن ہے جب کہ دوسری طرف ہفتہ میں ایک مرتبہ ہی کافی رہتا ہے۔ کنزے اس ضمن میں رقم طراز ہے: "حقیقت تو یہ ہے کہ روزانہ انزال ایک اوسط مرد کی استعداد ہو سکتا ہے"۔ اس لیے ہمارے معاشرے کی رو سے جنسی کارکردگی کی اجازت ملنے سے قبل جو مختصر دہائی آتی ہے اس میں جسمانی وظائف کے ضمن میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ جنسی اخراج کے نصف درجن طریقوں میں سے کسے واجب قرار دیں کسے برداشت کریں اور کسے ناپسندیدہ اور مردود!

کیا ہم کل اخراج کے ۱۰ فیصد میں شبینہ احتلام کی صورت میں مزید اضافہ کریں؟ کیا خود لذتی کی اجازت دی جائے، کیا جسمانی تناؤ سے ایسے چھٹکارے کو شرم و جرم سے ملوث کر کے مستقبل میں ازدواجی اختلاط میں میکانکی مہارت کے لیے باعث نقصان قرار دیا جانا چاہیے؟ کیا ہم جنسیت پر مبنی جنسی کھیل — کل اخراج کا ۶ فیصد سمجھ لیں — کو عارضی انحراف قرار دیں یا کجروی؟ اور ہر طرح کے حالات و مواقع سے قطع نظر کیا بوس و کنار — جو انزال پر منتج ہونے والے نقطۂ عروج تک پہنچنے کے لیے نصف سے زائد وقت لے لیتے ہیں — جسمانی عصمت کے تحفظ کے لیے باضابطہ طریقہ ہو سکتی ہے؟ بالفاظ دیگر اگر ہم شادی میں بہتر جسمانی مطابقت اور طلاق کی دلکشی میں کمی کے خواہاں ہوں تو ہمیں جنسی کارکردگی کے ضمن میں کئی امور برداشت کرنے ہوں گے۔ کئی کی تعلیم دینی ہوگی۔ کئی باتوں پر بے جھجک بحث کرنی ہوگی اور کئی پر غور و فکر کے وقت ضبط اور تحمل سے کام لینا ہوگا؟

ان تمام امور کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہمیں ان حالات کا جائزہ لینا ہوگا جن کے باعث اب جنسی تعلیم کی چھان پھٹک کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے اس کا بے ضرر اور محفوظ کرنے والے مواد بالا تین اہم عناصر سے تعلق ہے اور یہ جنسی کھیل یا جنسی آزادی پر عائد کردہ سرگونہ سزا میں کمی یا خاتمہ کا باعث بنتے ہیں ان کے نام ہیں۔ قیام حمل، جنسی متعدی امراض اور "پکڑے جانا"؟

ضبط تولید کے طریقوں سے نہ تو واقفیت کو روکا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی مختلف تدبیریں اور علاج پہنچ سے باہر ہیں۔ بڑھتی ہوئی تحقیقات ان کی قبولیت میں اضافہ ہی کریں گی۔ اب تو اس کا انحصار صرف حیض کی محفوظ مدت پر ہے اور یہ محفوظ مدت بہت محدود ہوتی ہے لیکن جب یقینی، سستے، قابل استعمال اور سہل الحصول طریقے دریافت ہو گئے تو قیام حمل کے لیے یہ محفوظ مدت دنوں تک نہیں بلکہ مہینوں تک پھیل جائے گی۔ اس دفتری نظام سے منسلک افراد کی سہولت کے لیے بعض نالیاں بند کر دینے سے یہ محفوظ مدت دائمی بھی کی جا سکتی ہے۔ بلکہ چین، ہندوستان اور پیرو (ریکو) کی دیہی آبادی کے لیے تو بالکل گھریلو تدابیر کی ضرورت ہے — یوں قبل ازدواج اور غیر ازدواجی اختلاط کے خطرہ حمل سے آزاد ہو جانے کے بعد ان سے وابستہ خیالات و نظریات میں لامحالہ تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔

جنسی ضمانت کے لیے خطرہ ثانی — جنسی متعدی امراض — سے بچاؤ کی تدابیر سوچی جا سکتی ہیں بلکہ اکثر تو قابل استعمال بھی ہیں اب تو بعض علاقوں مثلاً سکنڈے نیویا یا بعض امریکی ریاستوں نے ان جنسی متعدی امراض کی تشخیص و علاج کے لیے وہی انداز تشہیر اپنا رکھا ہے جو خناق یا چیچک کی دہشت نکالنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ احتیاطی تدابیر سے دونوں جنسی رفیق ایسے امراض سے محفوظ رہ سکتے ہیں اور "سلفا" (گندھک) ادویات اور پنسلین سے با آسانی اور فوری علاج ہو سکتا ہے۔ پیشہ ور طوائفوں کی مانند ان کے مستقلاً تبدیل ہوتے ہوتے گاہک بھی متعدی امراض کے بارے میں چھوٹی موٹی واقفیت حاصل کر کے ان سے بچنے کے لیے حفظ ماتقدم اور احتیاطی تدابیر اپنا سکتے ہیں — اور یوں ہر مرد خود کو جنسی متعدی امراض سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

اس کے بعد "پکڑے جانے" کی بدنامی کے اخلاقی نتائج ہیں۔ بوس و کنار کے لاتعداد مواقع ہوتے ہیں یہ بوس و کنار نقطۂ عروج تک لے جانے کا باعث بنتے ہیں لیکن مکمل اخراج کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ اعلیٰ سماجی طبقات میں اس پر بہت زور ملتا ہے اور وہیں سے دوسروں میں یہ پھیلی ہے۔ بعض ممالک میں بچوں کے ماتھے سے "ناجائز" کا کلنک دور کیا جا چکا ہے اور بعض امریکی ریاستیں بھی یہی کچھ کر رہی ہیں۔ کنزے کی فہرست سے قطع نظر بھی مناکحت کے لیے اب نسائی عصمت لازمی نہیں رہی۔

مندرجہ بالا امور سے واضح ہو جاتا ہے کہ جنسی تعلیم کا حال اور مستقبل کے تغیرات سے عہدہ برآ ہونا ناگزیر اور فقید المثال ہوگا۔ آبادی میں اضافہ ہماری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہونا چاہیے اور اس امر کا شاہد کہ عالمی پیمانہ پر تناسب پیدائش میں کمی کی ضرورت ہے۔ آبادی میں بے تحاشا اضافہ اس وقت اور بھی زیادہ خطرناک بن جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ زمین کی قوتیں انحطاط پذیر ہو رہی ہیں یہ امراض خبیثہ سے تحفظ اور ان کی روک تھام کے لیے وضع کردہ تدابیر کے اثرات کا صرف غیر ازدواجی اختلاط کی صورت میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ (واضح رہے کہ چکلے بند کرنے کے باوجود بھی یہ بیماریاں ختم ہو سکیں)۔ اس لیے اب یہ سوال ہے کہ اقتصادی اور تعلیمی معیار کی بلندی سے جنسی طرز عمل کن تبدیلیوں سے روشناس ہوگا اور یہ امر ہمارے منصوبہ سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

کنزے رپورٹ کے اثرات ہماری تحریروں، جنسی تعلیم کے ادوار اور ازدواجی مشوروں کے باب میں سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ یہ رپورٹ ہمیں بتاتی ہے کہ تعلیم آمدنی اور پیشہ کے لحاظ سے مختلف افراد کے جنسی اخراج کی غرض سے اپنائے گئے طرز عمل میں کتنا بعد اور فرق پایا جاتا ہے۔ جسے اعلیٰ طبقہ درست یا روا رکھتا ہے۔ نچلا طبقہ اسے مردود قرار دیتا ہے۔ یوں شادی بیاہ کے لیے مشورے دینے اور رہنمائی کرنے والے ان سے افادہ حاصل کر سکتے ہیں۔ کچھ مثالیں حاضر ہیں۔

شاید ہم کبھی بھی اس حقیقت سے واقف نہ ہو سکتے کہ آبادی کے کثیر حصہ کے لیے تمام جنسی کارکردگی دو منٹوں کے اندر اندر ختم ہو جاتی ہے اور اس کے باوجود بھی خاصی عورتیں جنسی ہیجان محسوس کر لیتی ہیں۔ اس طرح ہم کبھی اس کا احساس بھی نہ کر سکتے تھے کہ بے شمار افراد عریانی کو بیہودہ اور شرمناک سمجھتے ہیں اور اس کے مظاہرہ پر انہیں جو ذہنی کوفت ہوتی ہے اس سے ان کا جنسی ردعمل اپنی شدت گنوا بیٹھتا ہے۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو کپڑے پہنتے یا اتارتے وقت بھی اس سے بچے رہنے کی کوشش کرتے ہیں اسی لیے جسمانی جانچ کے لیے کسی معالج یا نرس کا کپڑے اتارنے کو کہنا بعض لوگوں کے اخلاقی معائیر کو متزلزل کرنے کا باعث بن جاتا ہے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پرائمری سکول سے آگے نہ جانے والوں میں ۷۵ فیصد افراد جنسی مجامعت کے وقت کپڑے نہیں اتارتے۔

اسی رپورٹ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ طبقہ میں تقریباً ۹۰ فیصد افراد کی شہوانی بیداری میں طویل بوسہ اہم ترین کردار ادا کرتا ہے جب کہ نچلے طبقات سے تعلق رکھنے والے مردوں کے نزدیک یہ "گندہ اور کراہت انگیز" ہونے کے علاوہ بیماریاں

کی منتقلی کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ حالانکہ یہ مردِ مشترکہ گلاس میں سے ایک دوسرے کا جھوٹا پانی پیتے رہتے ہیں" دہنی تناسلی مساس کالج کے طلباء (زیادہ تر شادی شدہ جوڑوں) میں، ہائی سکول کی نچلی جماعتوں کے مقابلہ میں تقریباً دوگنا (۲، فیصد) ملتا ہے۔ چھاتیوں کے مساس اور دستی تناسلی رابطہ کی بھی کچھ ایسی ہی حالت ہے۔ مجامعت کا انگریزوں اور امریکیوں میں مقبول عام انداز ــ عورت پشت کے بل لیٹی ہو اور مرد اس کے اوپر آجاتا ہے ــ عموماً دیگر ممالک میں نہیں ملتا یہاں قدیم یونانیوں، رومیوں اور مسلمانوں میں یہ ملتا ہے۔ امریکہ میں دیگر نمونوں کے مانند ½ صورتوں میں مرد کی بجائے عورت اوپر آتی ہے تنوع کے طور پر بالائی طبقہ کی ایک تہائی بھی ایسا ہی کرتی ہے ½ کروٹ کے بل لیٹ کر جماع کرتے ہیں جب کہ ½ جدت پسندی کے طور پر پشت کی طرف سے ہیں مندرجہ ذیل مثال سے عمومی قاعدوں اور گروہوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ کالج کی ایک گریجویٹ استانی نے آٹھویں جماعت کے ایک طالب علم کی سکول سے بے دخلی کے لیے اس لیے کوشش کی وہ ایک ۱۴ سالہ لڑکی کے ساتھ محوِ اختلاط تھا۔ یوں دونوں ہی کی بدنامی ہوتی ہے۔ دراصل استانی کو یہ علم ہی نہ تھا کہ اس کے طلباء میں سے ایک چوتھائی سے زیادہ جنسی تجربے حاصل کر چکے تھے۔

نچلے طبقہ میں خودلذتی، کمزوری اور غیر صحت مندی سمجھی جاتی ہے جب کہ" آبادی کا زیادہ تعلیمیافتہ طبقہ قبل ازدواج تسکین کے لیے زیادہ تر اس کا سہارا لیتا ہے (۸۰ تا ۵۵ فیصد) ان میں سے معقول تعداد (۹ فیصد) ایسے افراد کی بھی ملتی ہے جو شادی کے بعد بھی تسکین کے لیے اس ذریعہ کو برقرار رکھتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کالج کی تعلیمیافتہ عورتوں کا شہوانی ردّ عمل زیریں سطح پر ملتا ہے۔ کنزے کے بقول ایسے شواہد نہیں ملتے جن سے یہ تسلیم کیا جا سکے کہ کم عمری میں خود لذتی شروع کرنے والا لڑکا عنفوانِ شباب یا اس کے بعد سے اس کا آغاز کرنے والے کے مقابلہ میں زیادہ مضر اثرات سے دوچار ہوتا ہے۔ بہت سے اہل علم اور معالجین اس امر پر متفق ہیں کہ کچھ عمر گزار لینے کے بعد جلق سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

عنفوانِ شباب کے اوّلیں دور میں جنسی کارکردگی کے لحاظ سے اوسطاً فی ہفتہ ۲½ مرتبہ کی رفتار ملتی ہے ½ کی اوسط رفتار چار سے سات مرتبہ اور انتہائی صورتوں میں دن میں تین مرتبہ بھی ہے۔ تعداد کی ۔ یہ زیادتی طویل سالوں بلکہ بڑھاپے تک بھی جاری رہ سکتی ہے۔ جنسی کارکردگی کا جلد آغاز کرنے والے ۹۹ فیصد بنتے ہیں اور دیر سے شروع کرنے والے ۹۲ فیصد۔ مردوں کی اکثریت جلد از جلد نقطۂ عروج پر پہنچنے کی کوشش کرتی ہے اور ان کی کارکردگی ایک دو منٹ میں ختم ہو جاتی ہے بعض تو ۱۰ سیکنڈ کے اندر اندر فارغ ہو جاتے ہیں۔

اس ضمن میں تفصیلات کی ضرورت اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ افراد کے مستقبل کا ان سے گہرا تعلق ہے۔ خاوند ان کے باعث بیوی کے نقطۂ عروج تک پہنچنے کے لیے مطلوبہ وقت تک اپنی ایستادگی برقرار نہیں رکھ سکتا کنزے رپورٹ نے اس پریشان کن حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ مردوں کی اوسط تعداد کے اندر ایک سے دو منٹ تک بھی حالتِ دخول میں ایستادگی برقرار نہیں رکھ سکتی ہے جب کہ میری کتاب A THOUSAND MARRIAGES کے مردوں کا اوسط وقت پانچ منٹ سے زیادہ بنتا تھا اب کیا ہم میں نقطۂ عروج ملتوی کرنے کا دعوے کرنے کی ہمت ہے؟ ــ آخر خاموشی اور اخفاء کی حدود کہاں تک ہیں؟

ہم نے جنسی کردار کے لیے فارمولے اور سانچے متعین کر رکھے ہیں اور ان سے مطابقت کو ہم نارمل اور اوسط کا نام دیتے ہیں حالانکہ افراد کی مانند ان سانچوں میں بھی تنوع کی رنگا رنگ ملتی ہے۔ ازدواجی مشیر کے لیے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ فریقین کے جنسی سانچہ کے پیدا کردہ اثرات فراموش نہ کرے اس سے وہ شادی کی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں کچھ کہہ سکتا ہے۔ یہ مسئلہ زیادہ تر عورتوں سے تعلق رکھتا ہے۔ کنزے نے بھی گزشتہ جنسی جائزوں سے مستخرج ان نتائج کی توثیق کر دی ہے کہ کالج کی تعلیمیافتہ بیویوں میں سے دو تہائی میں ہیجانِ شہوت کا فقدان ملتا ہے اگر ازدواجی فریقین میں جنسی کردار کے لحاظ سے خوشگوار تناسب کی ضرورت ہے تو جھوٹی شرم، کراہت اور دباؤ کے طریق کار میں تبدیلی لانی ہوگی۔ اس مصنوعی شرم اور اخفا نے امتناعی صورت اختیار کر کے عورتوں کو ان کی جنسی استعداد سے محروم کر رکھا ہے چنانچہ کنزے کی دریافت کے مطابق تیس فیصد عورتوں میں جنسی ردّ عمل کا فقدان ہے لڑکے کے مقابلہ میں لڑکی میں کل تحریک یا جنسی ردّ عمل کا ½ ملتا ہے اس لیے ازدواجی مطابقت پیدا کرنے کے لیے غیر تعصبانہ طور سے ایسے امکانات و ذرائع کی ضرورت ہے جن میں عورت کی مناسب بیداری کے لیے خوشگوار طریقوں اور پسندیدہ مہارت سے کام لیا جا سکے۔ اس سے جسمانی محبت میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ ڈیوس سیریز میں کنواری عورتوں کی دو تہائی تعداد نہ صرف خودلذتی کی عادی ملتی ہے بلکہ ان میں سے نصف تو اس سے ہیجانِ شہوت بھی حاصل کر لیتی ہیں اور خودلذتی کی عادی عورتوں کے مقابلہ میں ازدواجی ردّ عمل کے لحاظ سے یہ زیادہ کامیاب بھی رہتی ہیں۔ ڈکنسن بیم نے بھی ان ہی نتائج کا اظہار کیا تھا اس طرح ہنری۔ ڈکنسن سیریز میں ہم جنس پرست عورتیں مردوں کی طرف مکمل طور سے راغب تھیں۔ اس مسئلہ کے منطقیانہ مطالعہ سے یہ واضح ہو جائے گا کہ کسی حد تک خود لذتی بھی مستقبل کے ازدواجی تقاضوں کے لیے عورتوں کی تربیت کر سکتی ہے۔ مثلاً خاوند کے جلد انزال ہونے کی صورت میں وہ اپنی مرضی سے خود کو نقطۂ عروج تک لا سکتی ہے۔

ہمارے پاس اعداد و شمار پر مبنی جو وسیع مواد ملتا ہے اس میں سے جگہ کی تنگی کے باعث ہم صرف چند حوالے دے سکتے ہیں۔ جنسی کردار کا انداز اوائل عمر ہی میں متعین ہو جاتا ہے جنسی کارکردگی کا جتنی جلد آغاز ہوگا۔ اس کا اختتام اتنی ہی دیر میں ہوگا۔ عنفوانِ شباب اور اس سے پہلے کی جنسی کارکردگی بالغانہ جنسیت میں کسی طرح سے بھی کمی کا موجب نہیں بنتی تمام جنسی تجربات میں سے ۸۵ فیصد مجامعت پر مبنی ہیں شادی میں جنسی اختلاط کی صورت میں جنسی اخراج کا یہی تناسب رہتا ہے۔ ایک تہائی مردوں نے کم از کم ایک مرتبہ غیر ازدواجی اختلاط کیا تھا لیکن یہ محض "اتفاقی" تھا۔ یہ اختلاط طوائفوں سے نہیں بلکہ اپنی واقف خواتین سے تھا اور عمر کی قیود سے آزاد تھا۔ کالج کے تعلیمیافتہ مردوں کے مقابلہ میں سکول تک پڑھنے والوں میں یہ تناسب دس گنا ہو جاتا ہے اس طرح پیشہ ور مردوں کے مقابلہ میں مزدوروں میں اس کا تناسب سولہ گنا ہو جاتا ہے۔ جہاں تک قبل ازدواج اختلاط کا تعلق ہے تو تمام عنفوانِ شباب تک پہنچنے والوں میں سے ½ نے اس کا اعتراف کیا اگر ہم سبھی سماجی طبقات لے لیں تو نصف تعداد کر چکی تھی۔ جب کہ بقیہ میں سے سکول تک پہنچنے والوں میں سے ۸۶ فیصد نہ صرف یہ کرتی رہی ہے بلکہ ہفتہ میں تین مرتبہ کی رفتار رہی ہے۔ اس رپورٹ میں کچھ مدت کے لیے ہر طرح کے جنسی اخراج سے مکمل اجتناب بھی ملتا ہے لیکن پھر بھی ان ۴۱۳ مردوں میں سے بھی عمومی لحاظ سے ½ سے ½ تک میں خودلذتی اور ہم جنس پرستی کے واقعات مل جاتے ہیں۔ نمایاں قسم کا اعصابی خلل بھی ان میں ملتا ہے۔ البتہ جنسی انقطاع کے بارے میں اس رپورٹ میں برائے نام ہی شواہد ملتے ہیں۔ امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن اور امریکن سوشل ہائی جینس ایسوسی ایشن کے سرکاری

اعلانات کے برعکس کنزے رپورٹ میں جنسی کردار کے لیے سزا کے طور پر بعد ازاں اپنائی جانے والی طویل مدّت کی پرہیزگاری کا تذکرہ نہیں۔ میری اپنی تحقیقات بھی کنزے کے برعکس ہیں

ہمیں کنزے کی اس تنبیہہ پر کان دھرنا چاہیے کہ اب ہمیں اپنی تحریروں میں جنسی رویّوں پر زیادہ توجہ دینی چاہیے کیونکہ یہ تکنیک سے زیادہ اہم ہیں۔ بچہ کی تعلیم کے لیے والدین کی تعلیم ضروری ہے اسی طرح معلمین کو تعلیم دینا ہے اس رپورٹ کی بہت سی ان دریافتوں کی توثیق کی جاتی ہے جن پر درمیانہ درجہ کے ماہرین اخلاق اور ناتجربہ کار اہل علم شور و غوغا مچا رہے ہیں۔ ہم یہ دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے کہ بہت سے ماہرین نے "نارمل" کی تعریف کرتے ہوئے کردار کے لیے اصول و ضوابط بیان کیے ہیں ان کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ ماہرین تحلیل نفسی اور سماجی کارکنوں کے برعکس (جو زیادہ تر غیر متوازن اور مریض حضرات سے تعلق رکھتے ہیں) یہ سب کچھ صحت مند اور عام آبادی سے اخذ شدہ ہے۔ علم الانسان کا ایک ماہر اپنی تمام جودتِ طبع اور ذہنی تیزی کے باوجود بھی "ترقی" پابندیوں کا اظہار کرسکتا ہے۔ ہمارے ذاتی تجربات اور ہمارے گروہ کے سماجی معائیر دوسروں کی جانچ کا معیار بن جاتے ہیں مثلاً جب بعض غیر متمدن علاقوں میں ہمارے مشنریوں نے کپڑوں کو مذہبی رنگ دے کر جانچ کے انداز کو نجات کا نسخہ بنا لیا تو لوگوں نے جانچ کے اس انداز کو "مشنری طریقے" کا نام دیدیا۔ اب ہم خوشی خوشی مستقبل کے اس دور کا تصور کرسکتے ہیں جب "اخلاق" اور "صحت مندی" میں رابطہ ہو جائے گا۔ جب دینیات، حیاتیات کے اصول اپنائے گی اور اخلاقی ضوابط اور جنس کے متوازن علم میں ہم آہنگی ہوگی — اس کا نتیجہ تربیت یافتہ نرم و نازک محبت کی صورت میں ظاہر ہوگا اور یوں ازدواجی بنیادیں باہمی سمجھوتہ پر استوار ہوں گی۔

اختتام پر اس موضوع سے واقفیت کی بنا پر میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ کنزے اور اس کے ساتھیوں کے اس کارنامہ سے قبل جنسی کردار پر کی گئی تحقیقات میں سے ایک بھی ایسی نہ تھی جس میں مندرجہ ذیل خصوصیات جمع ہوں۔

۱۔ ایک ایسے منصوبہ میں پرہمت، استقامت اور "علمی سلامت روی" کی برقراری جو دس سالوں پر محیط ہو اور ہر روز تین اجلاس ہوتے ہوں۔

۲۔ ۱۲/۰۰۰ افراد کے کردار کے بارے میں تفصیلی اور جامع قسم کی رپورٹیں اور اس کے ساتھ ہی ایک درجن جلدوں میں ایک لاکھ افراد کے لیے پروگرام کا منصوبہ۔

۳۔ رپورٹ کی تشکیل اور منصوبہ بندی میں ماہرین کا اجتماع۔

۴۔ خفیہ طریق کار ضبط تحریر میں نہ لایا گیا تھا صرف چار آدمی اس سے واقف تھے۔

۵۔ ½۸ × ۱۱ انچ کی ایک سنہری شیٹ پر ۵۰۰ جوابات آسکتے تھے اور ہر ایسی شیٹ پر اوسطاً ۳۸۰ جوابات ملتے ہیں۔ ان جوابات کو سوالوں کی صورت میں کارڈوں پر منتقل کر دیا جاتا تھا۔ اگر ٹائپ کیا جاتا تو یہ شیٹ کم از کم تیس صفحات پر محیط ہوتی۔

۶۔ انٹرویو لینے والوں کی مہارت کا اندازہ صرف انٹرویو دینے والے ہی کرسکتے ہیں بالعموم دو گھنٹوں میں ایک انٹرویو مکمل ہو جاتا تھا۔

۷۔ رپورٹ مرتب کرنے والوں کی جنسی ادب سے وسیع پیمانہ پر واقفیت ہی نہ تھی بلکہ حوالے کے لیے چار ہزار جلدوں پر مشتمل لائبریری بھی موجود تھی۔

۸۔ فی کس دو ڈالر خرچ کیے گئے جب کہ ہلٹنی نے ۳½ ڈالر خرچ کیے تھے ماہرین تحلیل نفسی نے سو گھنٹوں کے لیے فی کس ۷ ہزار ڈالر لیے — اور یہ کتنے سالوں تک؟

۹۔ افراد کو تعلیمی لحاظ سے تین اور پیشوں کے لحاظ سے سات گروہوں میں تقسیم کرتے ہوئے ان کی تمام امریکہ میں جغرافیائی لحاظ سے درجہ بندی کی گئی۔

جوفرے گورزیر

جنسی کارگزاری کی پیمائش

مشہور عالم کنزے رپورٹ کا تجزیاتی مطالعہ

جب کوئی کتاب دھڑا دھڑ بک رہی ہو تو یہ امر موجبِ دلچسپی بن جاتا ہے کہ اس میں آخر ایسی کیا خصوصیت ہے جو اسے طبع ہونے والی دیگر کتب سے ممتاز کرتے ہوئے اس ہمہ گیر فروخت کا باعث بنی۔ اس سوال کے تشفی بخش جواب سے کتب بین افراد کی پوشیدہ خواہشات اور فانتزیوں کے بارے میں بصیرت حاصل ہوسکتی ہے ساتھ ہی معاشرہ کے وہ نفسیاتی محرکات بھی اجاگر ہوتے ہیں جو کسی مخصوص کتاب کے سر پر عوامی پسند کا تاج دھرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ امریکی ناشر کتاب کی مقبولیت اور فروخت کے لیے شعوری کاوشوں سے بھی کام لیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی ایک کتاب کو قبول عام کی سند اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک اس میں پیش کیے گئے مواد اور عوام کی دبی ہوئی خواہشات اور فانتزیوں میں کوئی مشترک عنصر موجود نہ ہو۔

۱۹۴۸ء میں طباعتی تاریخ کا ایک نادر واقعہ ظہور میں آیا۔ ایک ٹھوس اور علمی کتاب — ایسی کتاب جو اعداد و شمار اور نقشوں سے بھری ہوئی تھی۔ جس کی قیمت بھی نسبتاً زیادہ تھی یہ خشک کتاب جس تیزی سے فروخت ہوئی وہ GONE WITE THE WIND اور FOREVER AMBER ایسے مقبول ترین ناولوں کی یاد دلاتی ہے۔ اس کا نام[1] (بلکہ غلط نام) یہ ہے۔ SEXUAL BEHRVIOR IN THE HUMAN MALE اور اسے مرتب کرنے والے صاحبان کنزے، پومرے اور مارٹن ہیں۔ اس کتاب نے بہترین فروخت والی کتابوں کی فہرست میں ہمیشہ کے لیے اپنی جگہ بنالی ہے۔ اس متنازعہ فیہ کتاب پر لاتعداد مضامین لکھے گئے۔ اس علمی کتاب کے فوری اثر کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں ۱۸۵۹ء تک جانا ہوگا جب ڈارون کی مشہور عالم کتاب ORIGIN OF SPECIES شائع ہوئی۔ لیکن فروخت کے لحاظ سے پھر بھی ان کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ — یا کوئی اور — کتاب پوری طرح سے معاشرہ پر اثر انداز ہوگئی ہوگی۔ ہمیں اس ضمن میں ہر طرح کی مبالغہ آرائی سے محترز رہنا چاہیے۔ خواہ یہ کتاب دس لاکھ کی تعداد میں بکے اور ہر جلد کا مطالعہ پانچ آدمی کریں تو اس صورت میں بھی یہ ۵۰ لاکھ افراد کل امریکی آبادی کا ۳ فیصد بنتے ہیں۔ لیکن اس کا اتنا بک جانا بھی کمال ہے اس لیے اس پر اظہار خیال اور عام عوامی پسندیدگی کے تجزیہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

جہاں تک قبل از اشاعت اشتہار بازی کا تعلق ہے تو وہ تاریخ طباعت میں ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کرچکی ہے۔ کیونکہ یہ اشتہارات ہی کا تو اثر تھا کہ خریداروں کی ایک مخصوص تعداد نے محض چٹخارے اور شہوانی گدگدی کے لیے اسے خریدا۔ لیکن اگر اس کی فروخت کی صرف یہی وجہ ہوتی تو جلد ہی اس کی بکری کم ہو جاتی جہاں تک چٹخارہ کا تعلق ہے تو اسے بلاشبہ جنسی موضوع پر خشک ترین کتابوں میں شمار کیا جا

---

[1] اس کے دوسرے حصہ کا نام یہ ہے۔ SEHUAL BEHAVIOR IN THE HUMAN FEMALE ۔ مترجم۔

سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اخبارات و جرائد میں چھپنے والے تبصروں اور تنقیدوں کے ضمن میں ایک طویل مدت تک اس کی تلخیصیات کبھی بھی نہ چھاپی جاتیں۔

میں یہاں اس کتاب پر علمی نقطہ نظر سے تنقید نہ کروں گا۔ کیونکہ خصوصی قابلیت کے حامل ماہرین نے اس کے مواد کی غیر تسلی بخش اور ناقابلِ اطمینان حیثیت پر اچھی طرح سے روشنی ڈالی ہے یا آنے والے دور میں ڈالیں گے۔ یہ وہ مواد ہے جس پر ڈاکٹر کنزے نے انسان کے جنسی کردار کے بارے میں عمومی اصول وضع کیے ہیں۔ بعض افراد کے ماضی والبتہ جنسی واقعات کو سو فیصد صحیح تسلیم کر لیا گیا ہے حالانکہ دنیا کی کوئی عدالت ماضی بعید کے واقعات کو مضبوط اور دستاویزی شواہد کے بغیر کبھی درست تسلیم نہیں کرتی۔ علاوہ ازیں تحلیلِ نفسی نے انسان کے جنسی طرزِ عمل کے بارے میں معلومات کا جو وقیع ذخیرہ جمع کر رکھا تھا اسے نظر انداز کرنے کے ساتھ (دانستہ) تحلیلِ نفسی کے بعض نظریات اور زاویہ ہائے نگاہ کو اپنے مواد کی صداقت تسلیم کرانے کی خاطر توڑ موڑ کر پیش کیا گیا اگر اس کتاب کو صرف ایسے علما اور ماہرین نے خریدا ہوتا جو اس پر واجبی تنقید کر سکتے تو اس کا حلقۂ اثر بہت محدود رہتا لیکن ہوا یہ کہ اسے لاتعداد عوام نے خریدا اور پڑھا اب ظاہر ہے کہ ــ تبصرہ نگاروں کی مانند ـــ یہ لوگ اس کے مواد کی علمی جانچ نہ کر سکتے تھے اس لیے ان سب کے لیے اس کے "حقائق" صحیح تھے۔

اس کتاب کی سب سے انوکھی خصوصیت ــ اور جس پر کتاب میں بھی بار بار زور دیا گیا ـــ یہ ہے کہ افراد میں جنسی کردار کے بعض ایسے پہلو ملتے ہیں جن پر (عام عقیدہ کے برعکس) وہ نسبتاً زیادہ عمل پیرا ہوتے ہیں۔ بس یہ سارا کمال ہے۔ حالانکہ کوئی بھی تعلیمیافتہ انسان افراد کے جنسی کردار کے ان مخصوص پہلوؤں سے کبھی بھی ناآشنا نہ رہا تھا۔ ڈاکٹر کنزے نے یہ کیا کہ ان کے بارے میں اعداد و شمار مہیا کر دیئے۔

سوال یہ ہے کہ اعداد کی اس رائی کا پہاڑ کیوں بنا لیا گیا؟ تبصرہ نگاروں نے یک زبان ہو کر اسے "ڈائنامیٹ" کیوں قرار دیا؟؟ اور بے شمار حضرات نے ان "انکشافات" کی روشنی میں جنسی کردار کے بارے میں وضع کردہ قوانین و قواعد پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے نوجوانوں کو اس ضمن میں دی جانے والی ہدایات اور تنبیہات کو تبدیل کرنے کی تجویزیں کیوں پیش کیں؟؟؟

میرے خیال میں اس کی بڑی وجہ جمہوریت کا پیدا کردہ وہ رجحان ہے جس کے تحت ہر بری بھلی بات کے حق میں آراء "کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے"۔ تھوڑے سے لوگ کچھ کہتے یا کرتے ہیں تو اس کے غلط ہونے کا امکان ہو سکتا ہے جب کہ بہت سے لوگ کچھ کہیں یا کریں تو۔ پھر وہ ٹھیک ہی ہوگا۔ اگر اسے اشتہار بازی یا زیادہ سے زیادہ ملکی سیاست تک محدود رکھا جائے تو بہتر ہے لیکن اس اصول کو اخلاقی، نفسیاتی یا عضویاتی کارکردگی پر لاگو کرنا قطعی غیر منطقی ہے۔

اسے یوں سمجھئے کہ جرمنی میں ڈاکٹر کنزے کے طریق کار پر مبنی ایک ایسی رپورٹ مرتب کی جائے جس میں انسانی غذائی طرزِ عمل کا اعداد و شمار سے جائزہ لیا گیا ہو۔ اب اس کی رو سے یہ معلوم ہو کہ جائزہ کی حدود میں آنے والے اسی فیصد افراد ایسے ہیں جو اپنی غذا سے روزانہ ۱۵۰۰ غذائی حرارے حاصل کرتے ہیں۔ جب کہ ۳، ۷ فیصد ایسے ہیں جو صرف ۲ حرارے حاصل کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ـــ اب ان "انکشافات" کی روشنی میں یہ ثابت ہو گا کہ دن کے دونوں کھانوں میں ۱۵۰۰ حراروں کی تقسیم "نارمل" اور صحت مند انسانی غذائی طرزِ عمل ہے سمجھئے! اب آپ غذا اور خوراک کے بارے میں تمام مروّجہ نظریات کو تبدیل کرالیں۔

لوگوں کی اکثریت اسے احمقانہ قرار دے گی۔ کیونکہ غذا اور خوراک کے موجودہ قواعد کو سائنس کے ذریعہ سے تعین کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ عارضی یا مقامی حالات کے پیدا کردہ تغیرات کے باعث انہیں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ یہی دلیل دیگر مسائل کے لیے بھی وزن رکھتی ہے۔ قابلِ اطمینان جنسی طرزِ عمل یا آدابِ جنسی کے بارے میں سائنس نے ابھی ایسے قواعد و قوانین وضع نہیں کیے۔ جنہیں سبھی نے اتفاق رائے سے تسلیم کر کے انہیں مسلّمہ حیثیت دے دی ہو (ڈاکٹر کنزے تو شاید اسے تسلیم نہ کریں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسانی جنس اور اس کے اعمال بے حد پیچیدہ اور الجھے ہوئے ہیں) اسی لیے کسی جائزہ سے مرتب شدہ اعداد و شمار کے ذریعہ جنس کے بارے میں کوئی دو ٹوک فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اتنا ہے کہ ڈاکٹر کنزے کے مہیا کردہ اعداد کی یوں بھی تشریح کی جا سکتی ہے کہ موجودہ امریکی آبادی کی جنسی زندگی میں بے راہ روی انتشارات کی اتنی ہی زیادتی ہے جتنی ہم عصر جرمنی میں کم خوری ہے۔

واضح رہے کہ میں جنسی کردار پر ضبط اور اس کی صحت کے لیے تراشیدہ قوانین میں ترمیم و تنسیخ کی افادیت کے نظریہ کے خلاف نہیں۔ لیکن اگر ایک قانون ۲ فیصد کی بجائے آبادی کے ۹۰ فیصد حصہ پر اثر انداز ہوتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس قانون کی خامی بے انصافی میں تبدیل ہو گئی ہے۔ البتہ اس کا یہ مطلب ضرور ہو گا کہ مجرموں کو دی جانے والی وحشیانہ سزائیں اب پہلے سے کہیں زیادہ ظالمانہ اور بے قاعدہ معلوم ہونے لگیں گی۔

اس کتاب کے دوسرے اہم پہلو کو جنس کی "جوہری تحلیل" قرار دیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر کنزے سے پہلے جنس کو عام طور سے انسانی افعال میں سب سے زیادہ پیچیدہ سمجھا جاتا تھا۔ افعال کی یہ پیچیدگی صرف تناسلی اعضاء تک محدود نہ تھی بلکہ انسانی شخصیت کے شعوری اور لاشعوری ـــ تمام نفسیاتی اور ہیجانی عناصر اس کے حلقۂ اثر میں آجاتے تھے۔ اس کے برعکس جب ڈاکٹر کنزے نے انسان کے جنسی کردار کا جائزہ لیا تو اس نے سیدھی سادی تناسلی کارکردگی کے علاوہ باقی سب کو فراموش کر دیا اور یوں جنس صرف اعداد و شمار کا کھیل بن کر رہ گئی۔

اس کتاب میں ایسے نقشے دیئے گئے جن کے ذریعہ ہر انسان جنسی قوت کے بارے میں "اپنا ٹیسٹ" لے سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے ٹیسٹوں میں بازی وہی جیتتا ہے جو جنسی کارکردگی میں سب سے زیادہ نمبر لے۔ یعنی سب سے زیادہ مجامعت کرتا ہو۔ لیکن علم الانسان سے معمولی سی واقفیت بھی اسے باطل ثابت کر سکتی ہے۔ غیر متمدن اور وحشی معاشروں کے بارے میں ہمارے پاس اتنی معقول معلومات ہیں جن سے (بظاہر) یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ لوگ محبت کو تسلیم کیے بغیر یا جنس میں کسی قسم کی دلچسپی لیے بغیر زیادہ تعداد میں مجامعت کرتے رہتے ہیں۔ میں نے تبت کی سرحد پر بسنے والے "لیپچایوں" کے طرزِ معاشرت کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ لوگ اوائلِ بلوغت میں جس کثرت سے مجامعت کرتے ہیں اس کے مقابلہ میں ڈاکٹر کنزے کے زیادہ نمبر لینے والے شرم سے پانی پانی ہو جائیں۔ ان لوگوں کے نزدیک جنس غذا کا درجہ رکھتی تھی۔ اور وہ اسے کھانے پینے سے زیادہ اہمیت بھی نہ دیتے تھے وہ محبت کو نہ مانتے تھے۔ اور اسی لیے وہاں قانوناً بیوی یا خاوند کو ایک دوسرے کا وفادار بنائے رکھنا ناممکن تھا۔ مجھے یقین ہے خود ڈاکٹر کنزے بھی غالباً اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ اس جائزہ میں سب سے زیادہ مجامعت کرنے والے مرد وہ ہیں جنہیں ہم "نرطوا ئفیں" کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ عام آبادی کے مقابلہ میں اس طبقہ کو ڈاکٹر کنزے کے جائزہ میں خاصی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ان لوگوں کی کارکردگی کو غالباً قابلِ رشک نہیں کہا جا سکتا۔

اس سلسلہ میں کی ایک اور "ضمنی پیداوار" بھی ہے ۔ جسے عقل و فہم اور دانشوروں کی مخالفت کا رجحان قرار دیا جاسکتا ہے ۔ بچوں کی کامکس" اور کارٹونوں میں پروفیسروں کے لمبے لمبے بال دکھائے جاتے ہیں جب کہ سائنسدان ہمیشہ "پاگل" ہوتے ہیں ۔ اب ڈاکٹر کنزے نے اپنے شواہد کی بنا پر یہ دعوےٰ کیا ہے کہ اعلیٰ ذہنی قوتوں کے حامل افراد کم پڑھے لکھے لوگوں کے مقابلہ میں "کم" "مرد" ہیں ۔ انہوں نے کم تعداد میں لڑکیوں سے جنسی تعلقات استوار کیے ہوتے ہیں اور وہ اپنی بیویوں سے زیادہ زیادہ وقفوں سے ہم بستری کرتے ہیں ۔ اب آپ خود ہی نتائج اخذ کرلیں ۔

مارکس کے جدلیاتی فلسفہ کی تعریف کرتے ہوئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر کنزے نے زندگی کی تمام قدروں کی بے قدری کی ہے ۔ غیر ارادی شبینہ احتلام، رسہ پر سے نیچے پھسلتا ہوا ننھا منا لڑکا، زنا بالجبر کرنے والا قاتل اور اپنی محبوبہ کے بازوؤں میں رات بسر کرنے والا محبوب ـــ ڈاکٹر کنزے نے ان سب کو گدھا اور گھوڑا سمجھتے ہوئے ایک ہی لاٹھی سے ہانکا ہے ۔ جسمانی طلب، بوالہوسی اور محبت ان سب کو انسانی کردار کی پست ترین سطح سے منسوب کر دیا گیا ۔ جس طرح ایک بھوکے کنبہ کا فاقہ ختم کرنے والا اور ایک ساہوکار کی تجوری میں جانے والا روپیہ ایک ایسا ہوتا ہے اسی طرح ڈاکٹر کنزے نے تمام جنسی کردار کو ایک ہی درجہ پر لے آتے ہیں ـــ یعنی وہ محض "نکاس" ہے ۔ وہ نکاس جو عضویاتی تشنج کو تسکین دیتا ہے اس لیے ایک ساہوکار کی مانند بدیوں کی زیادتی بہتر ہے ۔ عصمت و عفت بے معنی لفظ ہیں ۔ جب دارومدار "ٹیسٹ" کے زیادہ نمبروں پر ہو تو بھلا کم نمبر لینے کون پسند کرے گا ۔

کتاب کے اعداد و شمار سے دو اور باتیں بھی ذہن میں آتی ہیں ۔ ڈاکٹر کنزے نے جن آدمیوں کے انٹرویو لیے وہ بھی عضویاتی بے چینی کو برداشت کرنے کے قابل نہ تھے اور جیسے بھی بن پڑے وہ آسودگی کے خواہاں ہوتے ۔ امریکی ذرا سی بھی بھوک، پیاس یا سردی برداشت نہیں کرسکتے اسی لیے تو جگہ جگہ کھانے پینے کا اہتمام ملتا ہے اسی طرح یوں محسوس ہوتا ہے جیسے امریکی مرد جنسی خواہش کا معمولی تناؤ بھی برداشت نہیں کرسکتے اور وہ فوراً اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں ـــ خواہ یہ "حفظانِ صحت" کی خاطر ہی کیوں نہ ہو ۔

دوسری بات ـــ جو قدروں کی بے قدری کے باوجود بھی نمایاں ملتی ہے وہ یہ کہ لوگ اس اعلیٰ پایہ کی جنسی تسکین کے خواہاں نظر آتے ہیں جو عموماً میسر نہیں آتی ۔ ڈاکٹر کنزے کی رپورٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شادی سے قبل، لبعد یا وقتاً فوقتاً لوگ ہم جنسیت پر مبنی تعلقات استوار کرتے رہتے ہیں ـــ شاید یہ بھی اعلیٰ پایہ کی جنسی تسکین کی خاطر ہو ـــ ویسے بعض اوقات شراب پی کر "تفننِ طبع" کے لیے بھی ایسا کیا جاتا ہے یا عنفوانِ شباب میں نت نئے تجربات کا شوق بھی ایسا کراتا ہے لیکن ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے اکثریت کسی ناقابلِ حصول مثالی تصور کی خاطر ہم جنسیت اپناتی ہو ۔

اس مضمون کے مطالعہ سے کوئی صاحب یہ نتیجہ اخذ کریں کہ میں جنسی کردار کے بارے میں علمی تحقیقات کا مخالف ہوں تو اس سے مجھے دکھ ہوگا کیونکہ اس کے برعکس میں تو اس عقیدہ کا حامل ہوں کہ ہماری معاشرتی تحقیقات میں سب سے بڑا خلا اسی چیز کا پیدا کردہ ہے اور اس خلاء کے پر ہوجانے سے اس "دورِ تشویش" کی بے اطمینانی اور پریشان خیالی میں قدرے کمی پیدا ہوسکتی ہے لیکن ایسی تحقیقات کو بڑا جامع ہونا چاہیے یہ نہیں کہ ماہر حشریات کی مانند اڑتی بھڑ کے پروں سے بننے والا دائرہ ناپنا شروع کردیا ۔ وہ فعل جو انسانی محبت اور بچوں کو جنم دیتا ہے اس کی چھان پھٹک کے لیے کوئی اور ہی طریق کار ہونا چاہیے ہر معاشرہ میں محبت ـــ پاک یا ناپاک کی تخصیص نہیں ـــ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔ اس لیے جنس کے عضویاتی پہلو سے وابستہ نفسیاتی اور ہیجانی عناصر کا ختم کرنا اس کے وجود کے خاتمہ کے مترادف ہے ہمیں انسانی جنسی کردار کے بارے میں اعداد پر مبنی مطالعات کی ضرورت ہے لیکن یہ مطالعات جنسی کردار کے ہوں نا کہ جنسی اعضاء کے ۔

آیئے ! ہم اپنے اولیں سوالوں کا جواب تلاش کریں یعنی ڈاکٹر کنزے کی متذکرہ رپورٹ کو امریکہ میں قبولیت عام کی سند کیوں نصیب ہوئی ۔ میرے خیال میں اس کا جواب دو طرح سے دیا جاسکتا ہے ۔ اس کتاب میں ایک بات بھی ایسی نہیں جسے سگمنڈ فرائڈ یا ہیولاک ایلس کی بیشتر تحقیقات کی مانند انوکھی یا پریشان کن کہا جاسکے ۔ اس رپورٹ میں انسانی جنسی کردار کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں جسے ژرف نگاہی پر مبنی قرار دیا جاسکے ایسی بات جس کی وجہ سے ان دونوں ماہرین کے نظریات کو لوگوں نے پہلے مسترد کر دیا تھا ۔ آج کی مہذب تعلیم یافتہ اور شہری آبادی کے جنسی نظریات وطرزِعمل ـــ گو اس کا وقیع ہونا ضروری نہیں ـــ اور اس کتاب میں پیش کیے گئے خیالات میں یک گونہ مماثلت ملتی ہے اس لیے سب نے واہ واہ کے ڈونگرے برسائے ۔ جو ازبالااعلوٰ کا اس سے اچھا اور کیا مظاہرہ ہوسکتا ہے کیونکہ اس کتاب کی فقیدالمثال فروخت نے یہ واضح کر دیا کہ ڈاکٹر کنزے نے امریکی عوام کے مطالبات کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا ہے ـــ اور یہی اس کی مقبولیت کا راز ہے ۔

مارگریٹ میڈ

عورت کی جنسی زندگی

صدیوں سے عورتوں کی زندگیاں ان کے جنسی کردار کے گرد گردش کناں رہی ہیں ۔ کم عمر بچیوں کو بہت جلد یہ سمجھا دیا جاتا ہے کہ ایک دن وہ دلہنیں بنیں گی، اس کے تھوڑی دیر بعد مائیں اور گردشِ ایام نے اجازت دی تو دادی اماں بھی ! اس لیے لڑکیوں کے تمام کام بلکہ کارنامے ـــ چرخا کاتنا، کڑھائی، بنائی، امورِ خانہ داری اور رقص و موسیقی ـــ غرضیکہ اس تمام ہنرمندی کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ وہ بیوی اور ماں کی صورت میں تمام زندگی اپنے "پیشہ" میں کامیاب رہ سکیں ۔ مرد کے لیے اصل جنسی کارکردگی ـــ خواہ وہ اس کی شعوری توجہ پر مسلسل دخل اندازی کیوں نہ کرتی ہو ـــ محض چند لمحات کا معاملہ ہوتا ہے جب کہ عورت کے لیے یہ چند لمحات ـــ پہلے اور بعد ـــ ہر دو صورتوں میں قول و قرار کے بوجھ تلے دبے ہوتے ہیں ۔ مرد کے لیے پدری خواہشات اکتسابی ہیں لیکن عورت کے جسم کا ایک ایک خلیہ پکار پکار کر اسے ماں بننے کی یاددہانی کراتا ہے اور عورت بھی فطرت کی اس للکار پر پوری توجہ اور انہماک سے اپنی تمام زندگی وقف کر دیتی ہے ۔

اگر اس مسئلہ کا حیاتیات کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو نوعِ انسانی کے لیے یہ امر اساسی اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ مرد محبوب بننے کا خواہش مند ہوتا ہے وہ اس مقصد کے لیے سعیِ مسلسل سے نہیں کتراتا، وہ ہر ممکن طریقہ سے اپنی اہمیت منواتا ہے اور ولادت میں استحکامِ الفت کی خاطر ـــ وہ کسی قسم کی سعی یا قربانی سے بھی گریز نہیں کرتا ۔ عورت میں مادریت کی خواہش کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہے ۔ اسی لیے تو وہ ہر چاہنے والے کی چاہت کا جواب چاہت سے نہیں دیتی بلکہ اپنے انتخاب میں احتیاط سے کام

لیتی ہے حالانکہ کبھی مرد جوشِ الفت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ تہذیب اور تمدن سے معاشرہ میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں سے قطع نظر اگر سیدھے سادے مواقع کا جائزہ لیا جائے تو ایک محتاط اور دانشور عورت اس باہمت مرد کا انتظار کرنا پسند کرے گی جو ہونے والے بچوں کے لیے نان شبینہ کا بندوبست کر سکے۔ تہذیب سے حالات و نظریات کی تغیر پذیری کے باوجود بھی بنیادی طور سے یہ اصول غیر متبدل ہے۔ یہ درست ہے کہ اب بشر کے شکار کے لیے کسی طاقت ور اور توانا شکاری کی جگہ عاقبت اندیش اور کفایت شعار تاجر اور بنک کار نے لی ہے زندگی میں کامیابی یہی تو ظاہر کرتی ہے کہ یہ مرد جنسی تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ معاشی لحاظ سے آنے والی نسل کی کفالت کا بار اٹھا سکتا ہے۔ معاشرہ کے اعلیٰ اعزازات کا مستحق مرد خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو؛ ہونے والے بچوں کے مستقبل کو ترجیح دینے والی عورت ہمیشہ معاشرہ میں کسی مقام کے حامل مرد کا انتظار کرے گی۔ جہاں مرد کو یہ سیکھنا ہے کہ اسے پیدا کیے گئے بچوں کی خاطر ہر طرح کی محنت اور مشقت سے نہ کترانا چاہیئے وہاں عورت کو بھی یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ اسے صرف نگہداشت، احتیاط، کفالت اور محبت کے امتزاج سے پیدا ہونے والے حالات ہی میں بچوں کی پیدائش کا ذمہ لینا چاہیئے۔

— یہ صورت حال "اقرار" و "انکار" پر استوار طریقِ کار پیش کرتی ہے اس کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے۔

عورتوں کو "انکار" سیکھنا ہے نہ صرف اپنے ہونے والے محبوب سے "انکار" کرنا ہے بلکہ اپنی خواہشات سے بھی یہ انکار اس وقت تک برقرار رہے جب تک کہ انہیں ایسے شوہر کے لیے "ہاں" کہنے کی اجازت نہ ملے جو ان کی چاہت کے معیار پر پورا اترنے کے ساتھ ساتھ انہیں چاہتا بھی ہو۔ اس کے برعکس مردوں کو عورتوں کے لیے اپنی خواہشات اور جذبات کے لیے "ہاں" کرنی ہے پیشتر اس کے کہ وہ اپنی بیویوں سے وفادار رہنے کے لیے دیگر عورتوں کے بارے میں اپنی اکثر خواہشات سے "انکار" کرنے کا مشکل عمل سیکھیں۔ اقرار و انکار کے اس رشتہ میں انفرادی رجحانات اور بچپن کے مختلف النوع تجربات کی پیدا کردہ رنگا رنگی اور تنوع کے باوجود بھی عمومی لحاظ سے یہ تضاد قدرے مبہم ہے کیونکہ جوانی کی آمد آمد سے لڑکے خود بخود ہی جنسی خواہشات محسوس کرتے ہیں جب کہ لڑکیوں میں ایک حد تک انہیں "بیدار" کرنا پڑتا ہے۔

لڑکی یہ جان جاتی ہے کہ اگر وہ "نسائی فنون" کے ذریعہ اپنے حسن و جمال اور دلربائی میں اضافہ کر کے منتظر رہے تو ایک نہ ایک دن اس کا بحیثیت بیوی انتخاب کر کے اسے ماں کے کردار کی ادائیگی کا موقعہ دیا جائے گا۔ اب رہے قیامِ حمل، پیدائش اور دودھ پلانے ایسے حیاتیاتی اعمال — تو ان سب کا نسائی جنس سے کوئی تعلق نہیں قبل از شادی جنسی آزادی روا رکھنے والے معاشرہ میں ناجائز بچے پیدا کرنے والی عورت سے اس کی جنسی تجربہ کاری کے باعث بعد شوق شادی نہیں رچائی جاتی بلکہ اس لیے کہ وہ بچے کی پیدائش اور پرورش کے لحاظ سے نسبتاً زیادہ سمجھدار ہوتی ہے۔ بعض غیر متمدن معاشروں میں بیوی سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ شوہروں کی آسودگی کا وسیلہ بننے کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے گھر سے "باندھ" کر بھی رکھے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں ایسی شہوت پرست عورتیں بھی ملتی ہیں جو اپنی شہوانی آسودگی کی خاطر اپنے بچوں کو ٹھکرا کر ان کی نگہداشت سے گریز کرتی ہیں۔ عورتوں کے ہر وقت اپنے جنسی کردار میں مگن رہنے کی کئی وجوہات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب وہ بچہ کی پیدائش کے بعد ماں بن کر زندگی کی معراج پر پہنچتی ہیں تو بچہ کا وجود ان کے اپنے جسم ہی میں نشوونما پاتا ہے۔ شکاری پہلوان یا کھلاڑی مردوں کا اپنے جسم کے ساتھ گہرا رشتہ ہوتا ہے اس صورت میں جسم اور ان کی زندگی میں گہرا رابطہ ہوتا ہے۔ لیکن ان استثنائی مثالوں سے قطع نظر دنیا میں مردوں کی اکثریت کی کارکردگی یا کارناموں کا ان کے جسم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا خواہ وہ ملاح ہو یا پل تعمیر کرنے والا۔ حتیٰ کہ بچوں کا باپ بننے پر بھی یہی صادق آتا ہے۔ اسی لیے تو لڑکیاں پکوڑی گھنٹوں آئینے میں اپنا عکس دیکھتی رہتی ہیں اور بقول شاعر حالت یہ ہوتی ہے۔

انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینہ میں وہ — اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

اس کے برعکس لڑکے کسی کا گوہرِ مقصود بننے یا بچے پالنے کے خواب نہیں دیکھتے بلکہ وہ ملازمت ڈھونڈتے ہیں وہ منصوبہ بندی کرتے ہیں، تعمیرات میں حصہ لیتے ہیں وہ حصولِ مقصد اور تسخیر کے لیے خود کو کمربستہ کرتے ہیں۔

شاہراہ حیات پر عورت کے لیے بعض متعین اور مخصوص قسم کے موڑ آتے ہیں۔ آغازِ حیض سے جسمانی بلوغت، عصمت کا خاتمہ، حمل، پیدائش اور پھر اختتامِ حیض جس کے بعد بحیثیت عورت وہ تولیدی مقاصد کی بجا آوری کے ناقابل ہو جاتی ہے اب یہ دوسری بات ہے کہ اس کی شخصیت سے اس کے انفرادی رجحانات کا جوش و خروش ابھی تک ختم نہ ہو۔ اس کی زندگی کے یہ واقعات کیونکہ گئے زمانہ کی طرح لوٹ کر نہیں آ سکتے اس لیے ان کی شدت اور قوت ایک عورت کے لیے کافی سے زیادہ ثابت ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر ایک آدمی کسی فوج کا سپہ سالار ہے یا وہ کوئی نئی دوا دریافت کرتا ہے تو اس کی شخصیت کے ان پہلوؤں کا اس کی جنسی زندگی سے اتنا گہرا تعلق نہیں اس لیے — اب تک کے تمدنی مدارج کی روشنی میں — اگر مرد اور عورت کے مسئلہ کا جائزہ لیا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آغازِ الفت سے لے کر ماں بننے تک عورت مرد کے مقابلہ میں جنس کی کلی اہمیت کہیں زیادہ محسوس کرتی ہے حالانکہ عورت کے برعکس مرد کے لیے انفرادی جنسی فعل کہیں زیادہ اہمیت کا مالک ہوتا ہے۔

مرد اور عورت انسان ہیں گو ان کے جنسی اعضاء اور جنسی کردار ایک دوسرے سے ملتے نہیں۔ بعض دیگر معاملات میں وہ غیر معمولی طور سے ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اختلافات زیادہ تر جنسی نوعیت کے ہیں جیسے فن کارانہ رجحانات، منتظمانہ صلاحیتوں اور جسمانی مہارت وغیرہ کا انحصار زیادہ تر فرد کی جنس پر ہوتا ہے۔ دونوں جنسوں میں اعلیٰ ترین ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ کند ذہنی اور خبطی پن بھی ملتا ہے اسی طرح ہیجانی شدت اور جذباتی وارفتگی کے ساتھ ساتھ انتہائی سرد مزاجی اور دوسروں کے بارے میں لاتعلقی بھی ملتی ہے۔ انسان اپنی زندگی کو بہتر بنانے، اسے سنوارنے اور اس میں وسعت پیدا کرنے کے لیے سعی کناں رہا ہے اس نے گھر بنائے جو موسمی اثرات سے پناہ دینے کے علاوہ کچھ اور بھی تھے۔ اس نے اندازِ الفت وضع کیے جو صرف فوری جنسی تسکین کے لیے محض "ابتدائیہ" کی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ اس نے موسیقی کی دھنیں بنائیں۔ غلہ میں اضافہ اور خوراک کو بہتر بنانے کے لیے نت نئے طریقے ایجاد کیے۔ خدا سے اپنے رشتہ کی استواری کیلیے عبودیت کے کئی انداز اپنائے۔ ایسے سیاسی نظام اختراع کیے جو افراد کو ایک رشتہ میں منسلک کر کے قوموں کی تشکیل کا باعث بنے — اب یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان ایجادات اور اختراعات میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں نے اہم یا غیر اہم کیسا کردار ادا کیا۔ مچھلیاں پکڑنے، ہل جوتنے، باربرداری اور بیوپار، مذہب اور عبادات اور ان کے ساتھ ساتھ ہی جنسی کارکردگی۔ ان سب اور ایسے ہی دیگر اعمال میں سے عورت اور مرد پر ان کے بوجھ کا کیا کیا تناسب ہو؟

اس ضمن میں تقسیم کار پر شروع سے ہی زور دیا جاتا رہا ہے اور اس کے حق و قبح پر دلائل

براہین کا لامتناہی سلسلہ ملتا ہے لیکن یہ تقسیم کار اقتصادی یا مذہبی زندگی کے مقابلہ میں جنسی زندگی میں نسبتاً زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ کیا انسانوں کو صرف یہی سکھانا چاہیئے کہ مرد اور صرف مرد ہی میں فعال اور از خود پیدا ہونے والی جنسی خواہشات ملتی ہیں۔ اور عورت ۔ کم از کم شریف عورت ـــ کو اپنی فطرت کی مفعولیت اور لچک کی بنا پر بآسانی مرد کے پسندیدہ سانچے میں ڈھل جانا چاہیئے؟ یعنی اسے کبھی بھی انفرادی تسکین کی خواہش نہ کرنی چاہیئے؟ یا پھر انہیں یہی سکھایا جائے کہ مرد اور عورت دونوں ہی جنسی مفعول نہیں بلکہ ان میں مخصوص نوعیت کا جنسی ردّ عمل ملتا ہے۔ اگر وہ جنگل یا گھر میں تنہائی میسر آنے پر یا محض میاں بیوی ہونے کے باعث جنسی لحاظ سے بیدار ہوتے ہیں تو اس کا مطلب فریق ثانی کی عملی قسم کی جنسی خواہش کا مظاہرہ نہیں ہوتا اور کیا انہیں یہ سکھانا ممکن ہے کہ مرد اور عورت کو انفرادی مسرت کے حصول کی خاطر با عمل، پرجوش اور با مقصد ہونا چاہیے۔ ایک فریق دوسرے کے لیے مکمل ردّعمل کا اظہار کرے؟ بلکہ ایک دوسرے کی مسرتوں کے حصول کا ایک ذریعہ ہونا چاہیئے؟

یہ سب کچھ آزمایا جا چکا ہے:

ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں شریف خواتین کی شرافت کا یہ تقاضا تھا کہ جنس ان کے لیے ناگوار ہو۔ اگر ان کے خاوند ضرورت سے زیادہ تنگ نظر واقع ہوتے تو بیویاں اپنے خاوندوں کے سامنے بھی جھوٹی شرم کا لبادہ اوڑھے رہتی تھیں خواہ جنس ان کے لیے مسرت بخش اور افادہ بخش ہی کیوں نہ ثابت ہوتی ہو۔ جنس اور "خراب" عورت لازم و ملزوم تھیں۔ ان خراب عورتوں کا کوئی سماجی مقام نہ تھا اور انہیں مادیت کے ناقابل سمجھا جاتا تھا۔ ایسے انداز نظر سے افراد کے مخصوص اور انفرادی رجحانات کی تکذیب ہوتی ہے۔ فاعل عورت اور مفعول عورت میں کوئی تمیز نہ تھی اس طرح پرجوش مردوں اور ان مردوں میں بھی کوئی تفریق نہ تھی جن کا انحصار دوسرے فریق کے جوش پر ہوتا ہے۔ اس روایتی انداز فکر نے بعض عورتوں پر اس لیے "خراب" کا لیبل چسپاں کر دیا کہ دیگر عورتوں کو "اچھا" قرار دیا جا سکے۔ یہ روایتی جنسی نظریہ بہت سے مردوں اور عورتوں کی فطرت سے ہم آہنگ نہ تھا۔ کسی شے سے متاثر ہوتے ہوئے اس کے برعکس ردّ عمل اور حرکات کے لیے کافی سے زیادہ اداکارانہ صلاحیتوں کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے برعکس صورت میں ایسا نہ کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔

امریکہ میں جب عورت نے مرد کے دوش بدوش جہدِ زیست میں حصّہ لیا تو اس کی اقتصادی حیثیت میں تبدیلی آگئی۔ اسی طرح مغرب میں جب اسے بیرونِ خانہ کمانے کے مواقع میسر آئے تو اس کے حالات میں تبدیلی پیدا ہو گئی اور اب ہمارے دیکھتے دیکھتے نسائی پسند کے معیار بدل چکے ہیں۔ مخلوط تعلیم کی درسگاہوں میں لڑکے اور لڑکی کو ایک ہی سطح پر تعلیم دی جاتی ہے۔ انہیں انفرادیت ابھارنے کی تلقین کی جاتی ہے ان سے توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ چاک و چوبند ہوں اور اپنی پسند و ناپسند پر زور دے سکتی ہوں ۔ غرض کہ وہ اپنی شخصیت اجاگر کرنے پر قادر ہوں۔ لڑکے "چند" لڑکیوں کو ناپسند کرتے ہیں اور "سسی" (SISSY)[1] صرف لڑکوں ہی کو نہیں بلکہ لڑکیوں کو بھی کہا جاتا ہے ایک مرد کے لیے حسن گریاں کی کشش میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اس طرح مشتاق نگاہوں سے گالوں پر پھیلتی سرخی یا سانپ کے نام سے ہی لرز جانا ـــ یہ سب کسی بھی لڑکی کے حسن کے لیے غازہ کا کام کر سکتے ہیں۔ لیکن ۱۲ سالہ لڑکا ایسی لڑکیوں سے بہت جلد عاجز آ کر انہیں احمق قرار دے دیتا ہے ـــ اور یہ بارہ سال کی عمر کا زمانہ ہی تو ہے جسے ہم امریکیوں نے محبت بھرے گیتوں کی صورت میں لافانی کر دیا ہے۔

"جب تم نے میری سلیٹ پر لکھا ـــ جو!
مجھے تم سے محبت ہے
جب ہم ننھے منے تھے!"

آج تعلقات کے جس انداز کو "مثالی" قرار دیا جا رہا ہے اس کی رو سے ہم عمر لڑکے اور لڑکی کی تعلیم، مشاغل، ذوق اور دلچسپیوں میں یکسانیت لازمی ہو جاتی ہے اگر لڑکا کشتی رانی کا شوقین ہے تو لڑکی کا بھی یہی شوق ہو اگر وہ "سکی" (SKI) کا دلدادہ ہے تو اسے بھی سکی سے ہی دلچسپی لینی چاہیئے۔ ایک دس سالہ لڑکی نے "سسی" کی تعریف یوں کی "سسی وہ لڑکی ہے جو ایک مینار پر چڑھی اپنے خوابوں کے شہزادے کی منتظر رہتی ہے اس میں اتنی ہمت نہیں کہ مینار سے نیچے اتر کر اپنے شہزادے کی مدد کر کے اس کا ساتھ دے۔"

مثالی لڑکی کو مثالی رفیق کے روپ میں دیکھنے کی وجہ سے لڑکے اور لڑکیوں میں کم عمری میں آزادانہ میل ملاپ شروع ہو جاتا ہے۔ بلکہ امریکی لڑکے دیگر مغربی ممالک کے لڑکوں کے مقابلہ میں بہت ہی جلد لڑکیوں میں اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی لیے امریکہ میں مثالی شادی کا یہ مطلب ہے کہ وہ دونوں مل کر وہ سب کچھ کر سکیں جس کی وہ اپنے رفیقِ حیات سے توقع رکھتا ہو۔ لڑکا لڑکی کو آزاد اور خود مختار دیکھنا چاہتا ہے وہ اپنے پاؤں پر خود کھڑی ہو سکے وہ وقت پڑنے پر اپنے حق کی خاطر آواز بلند کر سکے، وہ کمانے کی اہل ہو ـــ شادی سے پہلے، بچوں کی پیدائش کے بعد، جب کبھی بھی حالات ناساز گار ہوں، بچوں کے پل جانے کے بعد، اور نہیں تو صرف اس لیے کہ وہ گھر میں بند رہنے کی بودیت کے باعث اس کے سر پر سوار نہ رہے وہ خود بھی زندگی میں اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہو کر ایک مقام حاصل کرنے کا خواہاں ہے کیونکہ والدین تعلیم دلانے کے بعد اس کے ذمہ دار نہیں بنتے اسے جو کچھ بھی کرنا ہے سب اپنی قوت بازو اور محنت سے اسی لیے وہ ایک ایسی جنس کو شریک حیات کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے جو جہدِ زیست میں اس کا مکمل ساتھ دے سکے۔ گو دنیا میں ایسے شوہروں کی کمی نہیں جو اپنی دلہن کو صرف اپنے لیے وقف دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس ضمن میں کسی قسم کی بھی شرکت گوارا نہیں کرتے۔ ملازمت ـ افسر اعلیٰ ـ فلمساز ـ افسر تعلقات عامہ ـ غرضیکہ وہ کسی سے بھی اس کی "شراکت" پسند نہیں کرتے۔ وہ بچوں کو صرف اس لیے اپنے اور گھر کے لیے وقف نہیں رکھنا چاہتا کہ اس میں اور کوئی اہلیت ہی نہیں بلکہ غالباً اس لیے کہ وہ دیگر امور کی بجا آوری کی اہلیت ـ مگر مہارت نہیں ـــ کے باوجود بھی گھر میں رہتے ہوئے اس کے بچوں کی ماں بننا پسند کرتی ہے۔

یورپ میں شادی سے پہلے کم عمر بیوی کے انتخاب میں والدین یا رشتہ داروں سے ـــ رفیق حیات کی حیثیت سے اس کی موزونیت کے بارے میں ـــ مشورہ لیا جاتا تھا۔ جنسی لحاظ سے تجربہ کار مرد بیوی کو جنس کے اسرار و رموز سے آشنا کراتا تھا۔ ایک زمانہ میں امریکہ میں بھی یہی کچھ ہوتا تھا مگر اب کافی دیر سے خیالات و نظریات میں بتدریج تبدیلیاں آتی جا رہی ہیں۔ گو جنس اور جنسی طرزِ عمل کے بارے میں انقلابی نظریات کا چشمہ یورپ ہے لیکن امریکہ میں ان کی قبولیت نے امریکی جنسی زندگی کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ یورپ میں اب اس اندیشہ کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ امریکی مرد عورت کے

---

[1] نسائی رجحانات رکھنے والے لڑکوں کے لیے کلمۂ تحقیر ـ مترجم ـ

مقابلہ میں بالآخر جنسی فروتنی کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہو گا۔ یورپ اور بالخصوص روایتی لحاظ سے فرانس میں مرد کی جنسی جسارت پر زور دیتے ہوئے عورت کو ایک ایسے نازک ساز سے تشبیہ دی جاتی ہے جس سے ایک ماہر مرد حصولِ نغمات کر سکتا ہے۔ برطانیہ میں بھی وکٹورین اخلاقیات کے بعد سے اس نظریہ کی وجہ سے اب جنسی تعلیم پر زور دیا جا رہا ہے۔ امریکہ میں ایسا نہیں ۔ یہاں عورت سے توقع رکھی جاتی ہے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اسے مثبت جنسی ردّعمل کا بھی اہل ہونا چاہیے۔ جس طرح امریکی لڑکیوں کا اندازہ ان کے موزوں سے لگایا جا سکتا ہے کیونکہ ان کے انتخاب میں احتیاط ملحوظ رکھنے والی لڑکی کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ مردوں پر توجہ دیتی ہے اس طرح اب ایک لڑکی سے جنسی معاملات میں مثبت ردّعمل کی توقع جائز سمجھی جاتی ہے۔

مثبت ردّعمل کا مطلب یہ ہے کہ شادی سے قبل مردوں سے ملنے جلنے کے کثیر التعداد مواقع کے دوران وہ جنسی فعل سے انکار کر سکے، اسے ملتوی کرنے کی اہل ہو اور دھتکارے بغیر ناپسندیدہ مردوں سے پیچھا چھڑانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اس صورت میں مرد اور عورت دونوں پر ہی بھاری ذمہ داری آن پڑتی ہے۔ ذمہ داری کے بوجھ کا اس کھیل سے کوئی تعلق نہیں جو محض ملاقاتوں کے لیے مناسب ہونے کے باوجود بھی تکمیل نہیں پاتا۔ نہ ہی شادی کے بعد مکمل جنسی آسودگی سے اسے کوئی واسطہ ہے کیونکہ غالباً موجودہ دور کی عورتیں مکمل جنسی نقطۂ عروج سے اتنی ہی دور ہیں جتنی ان کی دادیاں ۔ جن کے لیے مفعول اور غیر ہیجانی جنسی کردار پسند کیا جاتا تھا۔ ایسے حالات میں بعض عورتیں بناوٹ اور جنسی تصنع سیکھ جاتی ہیں بلکہ ہر دور کی عورت کو اپنے عہد کے مخصوص تمدنی تقاضوں اور جنسی نظریات کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے لیے بناوٹ اور تصنع سے کام لینا ہی پڑتا ہے۔

یورپ میں جب جھوٹی اخلاقی قدروں اور بیان و اظہار اور حصولِ معلومات پر عائد کردہ پابندیوں سے اذہان آزاد ہوئے اور فرائیڈ اور ہیولاک ایلس نے زمانہ کے مروّجہ عقائد کو باطل کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ جنس اس کی استعداد اور اس کے امکانات کا دائرہ کس حد تک وسیع ہے یوں نئے نئے خیالات و نظریات کا اظہار ممکن ہو گیا۔ جب ایک نوجوان جوڑے کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بلحاظِ جنس انسانوں میں تنوع کے صدہا انداز ملتے ہیں ان کے اوقات، شدت اور خصوصی رجحانات میں یک رنگی نہیں ملتی تو وہ خود بھی اپنے داخلی جنسی آہنگ کی دریافت سے اپنی جنسی زندگی کا ایک انداز متعین کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے مزید تجربات کی ضرورت کے ساتھ ساتھ اس نکتہ کو سمجھنے کی بھی ضرورت ہے کہ جنسی مطابقت قوتِ ارادی کی مرہونِ منت نہیں ۔ مرد اور عورت میں ذہنی ہم رنگی اور طبیعت کی موافقت اس کی موجودگی کی دلیل نہیں ۔ الغرض ایں سعادت بزورِ بازو نیست والی بات ہے! ذہنی یک رنگی کا اتنا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مزاج اور موڈ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں جنس پر مثبت توجہ دی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں جنس ازدواج کے لیے ایک اہم ۔ مگر لازمی نہیں ۔ عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔

آج کی امریکی لڑکی نے امریکی لڑکے کی مانند جب کار چلانی سیکھی۔ امریکی لڑکے کی مانند معاشی لحاظ سے خود کفیل ہونے کی سعی کی اور امریکی لڑکے کی مانند اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی تو اس سے حالات میں بھی کچھ تبدیلی پیدا ہوئی۔ آج سے ربع صدی قبل عورتوں کی معاشی آزادی سے اس خدشہ کا اظہار کیا جاتا تھا کہ ان میں شادی سے فرار کا رجحان بڑھ جائے گا۔ گھر گرہستی کے بوجھ اور بچوں کی ذمہ داریوں سے گریزاں عورت مرد کو محبوب کی حیثیت سے تو قبول کر لے گی لیکن شوہر کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرے گی مگر معاملہ

اس کے برعکس ثابت ہوا۔ جب عورتوں کو والدین سے دور، خود کماتے ہوئے آزاد اور خود مختار زندگی بسر کرنے کا موقعہ ملا۔ تو انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ جوش اور پُر اعتماد طریقہ سے شادی اور بچوں کو پسند کیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ آزادی کے باعث اب وہ اپنے خاوندوں پر زیادہ تنقیدی نگاہ ڈالتی ہیں، نا آسودہ ازدواجی تعلقات کے جوئے کو اتار پھینکتی ہیں اور بچوں کے درخشاں مستقبل کی خاطر "ہل من مزید" کا نعرہ لگاتی رہتی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ شادی کی خواہاں نہیں رہیں۔

آج کل کی لڑکی ایک حد تک لڑکا بن چکی ہے ان کا وہی انداز ہے جو بچپن میں بلیو جین پہنے لڑکوں اور لڑکیوں کا ہوتا تھا۔ رشتۂ انسانیت میں منسلک ہونے کے باعث ان کے مقاصدِ حیات دن بدن قریب تر ہوتے جا رہے ہیں اب یہ داستانِ پارینہ بن چکی ہے کہ لڑکی خوابوں کے شہزادہ کی منتظر ہے جو آئے اور اسے آکر حاصل کرے۔ شرمیلی عورت پھولوں کی ڈالیوں کے زیرِ سایہ مرد کی منتظر ہے کہ وہ رزم گاہِ حیات سے فراغت کے بعد اگر آکر اسے منتخب کر لے تو زندگی ازدواجی مسرتوں سے سنور گئی ورنہ تمام عمر یوں ہی گزار دی۔ جنسی رموز سے آشنا مرد فاعل ہوتا تھا جب کہ مفعول لڑکی کو جنس سے کسی قسم کی دلچسپی نہ ہوتی تھی۔ اب یہ قدیم اندازِ فکر ختم ہی نہیں ہو چکا۔ بلکہ اب تو معاملہ اس کے برعکس ہے کیونکہ اب لڑکے اور لڑکی دونوں میں شادی، بچوں اور ان کی پرورش کی خواہش پائی جاتی ہے۔ اب دونوں ہی شادی کو منصوبہ جات قرار دیتے ہوئے احسن اور قابلِ حصول سمجھتے ہیں۔

ان ذہنی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ مادریت کے لیے بھی انداز نو وضع کیے گئے ہیں۔ "فطری وضع حمل" اور "خوراک کی خود طلبی" ان میں سے نمایاں مثالیں ہیں۔ جدید سائنس کی امداد سے اب زندگی کے ان پہلوؤں کو زیادہ سے زیادہ فطری اور بے ساختہ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے حالانکہ اس سے قبل اس دور کی جدید ایجادات نے ان کا فطری بے ساختہ پن چھین لیا تھا۔ بوتل سے دودھ پلانا۔ جسم کا ٹن کرنا اور ہسپتال میں زچگی وارڈ کا نظام کار اس کی مثالیں ہیں۔ اب عورتیں بچوں کے ساتھ زیادہ "اپنے آپ" میں آکر زندگی بسر کرنے کے طریقوں کی جستجو کر رہی ہیں ۔ ایسے طریقے جس سے وہ وزن اور پیمانوں پر مبنی عالمگیر فارمولا سے محترز رہ کر اپنے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ اپنے بچوں کی دھڑکنوں کو ہم آہنگ کرتے ہوئے ان کے لیے کچھ کر سکیں۔

اب جب کہ زندگی کے بارے میں یہ بصیرت مقبول ہوتی جا رہی ہے تو یہ حقیقت ۔ اور یہ جنسی احساسات سے بھی زیادہ واضح ہے ۔ نمایاں تر ہو رہی ہے کہ اگر ایک عورت ۔ زیادہ سے زیادہ ۔ مرد کی مانند جنسی نقطۂ عروج تک نہیں پہنچ سکتی تو اس پر فوراً تیمداتی کا لیبل لگا دیا جاتا ہے ۔ جب زندگی کے ان شعبوں میں بھی جہاں مقابلہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اگر برابری کی خاطر مسابقت ہو تو ایسے ہی خطرات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لڑکیوں میں لڑکوں جیسی آزادی اور بے باکی کی تربیت دی جاتی ہے اس لیے وہ بھی دباؤ کا شکار ہو جاتی ہیں۔ امریکی لڑکیوں کو ایک سانچہ میں ڈھالنے والے اس اندازِ فکر کے باعث "فطری" وضع حمل مقصود بالذات بن جاتا ہے ۔ کامیابی کی ایک نشانی! یوں وہ دل کی گہرائیوں میں ایک داخلی تضاد کا باعث بنتا ہے۔ یہ کچھ اس طرح سے ہے جیسے مردوں کو اچھے اور کامیاب "عاشق" بننے کا حکم دے دیا جائے قطع نظر اس سے کہ ان میں مباشرت کی خواہش بھی موجود ہے یا نہیں؟ بچوں کی افزائش، طبعی موروثی جسمانی ساخت اور مناسب ماحولی اثرات کے مابین ایک غیر مرئی رابطہ ہے لیکن ہمارے ہاں تو مامتا اور مادریت نے کھیل کی

صورت اختیار کرلی ہے۔ ایسا کھیل جس میں عورتیں زیادہ سے زیادہ کامیابی کے لیے ایک دوسرے سے مقابلہ کرتی نظر آتی ہیں۔ کارِ الفت اور مادریت میں مشق سے خوبی حسن اور اپنے انداز میں دانش تو پیدا کی جاسکتی ہے لیکن نہ تو انہیں افراد پر سلطایا جاسکتا ہے اور نہ ہی اشیاء کی مانند کارخانوں میں بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں بھی انائی تسکین کے لیے ایک کھیل سمجھ لیا گیا ہے۔

عالمگیر جنگ ثانی کے بعد امریکہ میں ایک نئی طرح کی شادی کا رجحان بڑھتا جارہا ہے اس شادی کی بنیاد بے تکلفی، ذہنی رفاقت اور قبولیت پر استوار ہے۔ یہ کم عمری کی شادی ہے اور اس کا مقصد ہے باہمی رفاقت سے بچوں کی پیدائش! اب تک امریکہ میں کبھی بھی کم عمری کی شادی کا یہ انداز مروج نہ رہا تھا۔ عورتیں اس اندیشہ سے پریشان ہیں کہ شادی اور بچے ان کی ملازمتوں میں رکاوٹ نہ بنیں اس لیے اب انہوں نے اپنے رفیق کے لیے آزادانہ جستجو شروع کردی ہے ادھر سرد جنگ کے غیر یقینی حالات اور بھاری انکم ٹیکس کے بوجھ تلے دبا مرد بڑھاپا آرام سے بسر کرنے کی خاطر حصولِ مکانات کی بجائے اب حال کو طمانیت سے گزارنے کے لیے اپنی بیوی سے گھریلو معاملات میں تعاون کرتا ملتا ہے۔ اسی لیے تو وہ صبح پانچ بجے بچوں کو دودھ پلا کر تفریح کے لیے سمندر کے ساحل پر لے جاتا ہے۔

ایسی شادی کو سب سے زیادہ خطرہ زمانہ سے ہوسکتا ہے اکیس سال کی عمر میں شادی کرنے والی لڑکی اگر چار بچے بھی پیدا کرے تو وہ کم از کم چالیس برس کی عمر تک تمام بچوں کو زندگی میں ان کے مقام دلا سکتی ہے پچاس سال تک وہ دادی اماں بن چکی ہوگی اور زندگی کے آئندہ پچیس سال ایسی ماں کے مستقبل پر ایک دھند کی مانند ملفوف ہوتے ہیں جو اپنے بچوں کی آزادی کے اس تجربہ سے لطف اندوزی دیکھتی ہو جس کا بیج خود اس کے ہاتھوں بڑے جوش اور سرگرمی سے بویا گیا تھا۔ جب میاں بیوی کی ازدواجی زندگی کی بنیاد بے تکلفی اور خوش کن رفاقت پر استوار ہو جب انہوں نے ہنستے کھیلتے بچوں کی پرورش کی ہو اور جب دل بہلاوے کے لیے بہاڑوں کی پکنک پارٹیاں ہوں تو ایسی صورت میں بچوں سے خالی گھر میں کھانے کی میز پر ہر روز ایک دوسرے کے بے تاثر چہروں کو دیکھ دیکھ کر ان کی کیا حالت ہوتی ہوگی؟ ان کے رشتہ میں کسی قسم کی پیچیدگی اور گہرائی نہ تھی۔ مرد میں شہوانی چابکدستی کا فقدان تھا۔ کیونکہ جب کبھی بھی اس سے کارِ الفت کے انداز میں تنوع، جسارت یا جدّت کے لیے کہا گیا تو اس نے اس کے جواب میں عورت سے "فطری جنسی احساسات" کے اظہار کا مطالبہ کیا۔ اب تنہا گھر میں یہ سب کچھ ان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مردانہ کارِ الفت کا انحصار چابکدستی یا متوجہ نہ رہنے پر نہیں بلکہ اس کے لیے جوشِ حیات اور شدت کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے یا تو اکثر مرد اس وقت تک جنسی اشتہا ختم کرچکے ہوتے ہیں اور یا پھر اٹھتی جوانیوں میں وہ گم شدہ چشمۂ شباب کی جستجو کی سعی کرتے ہیں ادھر عورتوں نے کیونکہ جنس اور ماتا کو ملا کر کامیابی کے لیے انائی تسکین کا سہارا ڈھونڈا تھا اس لیے وہ اب خود کو بے سہارا، ناآسودہ، بے چین اور بلا ضرورت محسوس کرتی ہیں۔

حالات کا جائزہ لینے پر یہ واضح ہوجاتا ہے کہ بیسویں صدی کے وسط میں مروج ازدواجی طولانی کی خوش وقتی، احساس، رفاقت اور ہمت کے باوجود بھی زندگی کی آخری تہائی ایک خطرناک موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ نوجوان اپنے والدین کی صورتوں میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ہر نئی صبح اس فکر اور تشویش میں اضافہ کرتی جاتی ہے انداز نو پر مرنا ہمارا قومی شعار ہے۔ کسی مخصوص حلقہ سے وابستگی اور اس وابستگی کی مسرت سے ہم ناآشنا رہتے ہیں۔ ادھیڑ عمری میں پیدا ہونے والی ان ازدواجی مشکلات کا ایک حل ہوسکتا ہے۔ اس حقیقت سے چشم پوشی کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ احساس دیوانہ وار محبت کرنے والے جوڑے میں بھی ملتا ہے ورنہ بیوی ایسے سوالات سے کبھی بھی "تجدید عہدِ وفا" کی سعی نہ کرتی۔

"تم ہمیشہ، مجھ سے محبت کروگے نا؟"

"مجھے بتاؤ" "کیا تم" ہمیشہ ہمیشہ "کے لیے میری چاہت اپنے دل میں رکھوگے؟"

اس مسئلہ کو صرف ایک ہی — روایتی امریکی — طریقہ سے سلجھایا جاسکتا ہے اور وہ ہے — تغیر! خاوند کے لیے نئی ملازمت، بیوی کے لیے نیا سماجی حلقہ، نئے ماحول میں نئے احباب! غالباً یہ طریقہ سب سے آسان ہے۔ شبِ زفاف میں جس طرح شوہر کا اولیں بوسہ اور بیوی کی خود سپردگی دونوں کو ہم آہنگ کردیتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت سے نئے مکان میں آکر روشناس ہوا جاسکتا ہے۔

ایک حل اور بھی ہے!

عنفوانِ شباب میں ازدواجی تعلقات پیچیدگیوں سے معرا ہونے کے باعث خوشی اور مسرّت کا موجب بنتے ہیں یوں ازدواجی سفر ہموار رہتا ہے۔ ادھیڑ عمری کا سہارا بننے والے اشغال کی ترویج سود مند ثابت ہوتی ہے۔ کھانا پکانا، باغبانی اور اشیاء کا جمع کرنا وغیرہ ایسے مشغلے ہیں جو عمر کے اس بنجر حصہ میں خوشیوں کے پھول کھلا سکتے ہیں۔

اس مسئلہ کا — جنس سے قدرے چشم پوشی پر مبنی — ایک خالص زنانہ حل بھی ہے۔ بچوں کے بڑے ہوجانے کے بعد عورتوں کو خود میں بعض مخصوص کاموں کی اہلیت پیدا کرلینی چاہیئے تاکہ خاوند کی مانند ان کے لیے بھی جنس اور گھر ہی تمام زندگی نہ ہوں بلکہ زندگی کی وسعتوں میں نسبتاً کم اہمیت حاصل کرلیں۔ ادھیڑ عمری میں (بحیثیت بیوی) عورتوں کے مطالبات میں جو ناقابل برداشت شدت پیدا ہوجاتی ہے اور جس کے تحت وہ خاوند سے ایسی رومانی آسودگی کی خواہاں ہوتی ہیں جو نہ تو اس کے بس میں ہے اور جس کے بارے میں خود ان کے خیالات میں بھی وضاحت نہیں ہوتی۔ ایسی عورتوں کو اس طریقہ سے غالباً یقینی حد تک ٹھیک رکھا جاسکتا ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ دونوں کے لیے ازدواجی تعلقات کو انفرادی رنگ دینے کی ضرورت ہے خصوصیت سے عورت کے لیے جو بچہ گاڑی کے پاس بیٹھی ہوئی یا رات کے کھانے کے لیے سبزی چھیلتی ہوئی سوچ بچار اور تصورات کے لیے کافی وقت رکھتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے جنسی آہنگ، تبدیلیوں کی صلاحیتوں اور تکمیل کی خواہشات کے بارے میں سوچ سکتی ہے جو جنسی ادب محض جنسی تعلقات کے تواتر پر اعداد و شمار مہیا کرتے ہوئے آسودگی کی اقسام کی درجہ بندی کرتا ہے تاکہ مرد یا عورت اپنی جنسی زندگی کا قومی معیار کے ساتھ موازنہ کرسکیں۔ ایسا جنسی ادب عورت کی آزادانہ سوچ کے لیے ممد ثابت نہ ہوگا۔ اس کے برعکس مردوں اور عورتوں کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ انسانوں کی جنسی استعداد میں تنوع کے صدہا انداز ملتے ہیں۔ ہیجانی آسودگی کا باعث بننے والے طریقے کتنے پیچیدہ ہیں اور انتہائی مستی تک پہنچانے والی تکنیک میں کس قدر بوقلمونی ملتی ہے جب انہیں جنسی احساسات کی وسعتوں اور گہرائیوں کا اندازہ ہوجائے تو انہیں بچوں اور نوجوان والدین کو سمجھنے میں آسانی رہے گی اس سے نوجوان محبوب ادھیڑ عمری میں بھی نوجوان ہی رہے گا۔ اس سے جب دنیا میں جنس کے مقام کا اندازہ ہوجائے گا تو اسے سمجھنے اور اس کی گہرائیوں کو ناپنے کی اہمیت بھی واضح ہوجائے گی یوں جنسی ایک جہانِ نو کی صورت اختیار کر جائے گی۔

ہم ان لوگوں میں سے نہیں جو حصولِ معلومات کے لیے صرف روایات پر انحصار رکھتے ہوں۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہم نئی دریافتوں سے بھی متمتع ہونا چاہتے ہیں۔ اب جبکہ جنسی تحقیقات کی جاسکتی ہیں۔ جنس پر لکھا جاسکتا ہے۔ جنس کے بارے میں غور و خوض کیا جاسکتا ہے تو اب شرم و اخفا کا پردہ چاک کیے بغیر بھی ہر انسان کے لیے مطالعہ سے جنسی دانشمندی میں اضافہ ہوسکتا ہے پہلے لوگ ایسے سوالات سے پریشان رہتے تھے:

"کیا میں نارمل ہوں؟"

"کیا میری جنسی زندگی دیگر افراد ایسی ہے؟"

مگر اب ایسے سوالوں کی جگہ یہ سوال لے سکتے ہیں "جنس کیا ہے؟" — "اس میں کس حد تک تنوع ملتا ہے؟" — "میں کیا ہوں؟ عورت کیا ہے؟ ہم دونوں ایک دوسرے کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ ایک دوسرے کے جذبات کا سمجھداری سے کیسے جواب دیا جاسکتا ہے؟ اور شادی کے نام پر جو پیمانِ وفا باندھا ہے اسے کیسے زیادہ سے زیادہ خوشگوار اور سودمند بنایا جاسکتا ہے"؟

لارا ہٹسن

یہ کنوارے — یہ کنواریاں

— غیر شادی شدہ افراد کا نفسیاتی مطالعہ —

غیر شادی شدہ افراد پر مشتمل آبادی دو حصوں میں تقسیم جاسکتی ہے۔ وہ جو بالآخر شادی کریں گے اور وہ جو ہمیشہ کنوارے رہیں گے۔ پہلا گروہ نوجوانوں پر مشتمل ہے اب یہ دوسری بات ہے کہ ان میں سے کچھ — خصوصیت سے لڑکیاں — دوسرے گروہ میں جا ملیں گی۔

اس موقع پر ہم ان غیر شادی شدہ افراد کے جنسی، ہیجانی اور سماجی مسائل اور مشکلات کا محاکمہ کریں گے جن کے مستقبل کے تجربات میں سے شادی ایسا کوئی تجربہ نہ ہوگا۔ ان میں سے اکثریت تو ایسے معمر افراد کی ہے جو شادی ہونے کے عام دور سے گزر آئے ہیں لیکن ان میں ایسے افراد بھی شامل ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے شادی نہ کرنے کا تہیہ کیے بیٹھے ہیں۔

اس ضمن میں مرد اور عورت کے مابین بڑا فرق نظر آتا ہے۔ انگلینڈ میں مردوں کی اقلیت ہے۔ اس لیے عورتوں کے لیے خاوندوں کی قلت ہے اور یوں شادی کی امیدوار عورتوں کی ہمیشہ کثرت ہی رہے گی اعداد و شمار سے اس اکثریت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے یہ بھی جانتے ہیں کہ لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیوں کی پیدائش کا تناسب زیادہ ہے ۱۹۳۱ء کی مردم شماری سے معلوم ہوتا ہے کہ شادی کے قابل — پندرہ سے انیس سال کی — لڑکیوں کے مقابلہ میں مردوں کی تعداد میں چھتیس ہزار دو سو کا اضافہ تھا۔ بہت سی سماجی وجوہات مثلاً نقلِ وطن وغیرہ کی وجہ سے شادی کے قابل دوسرے گروہ یعنی بیس سے چوبیس سال کی عورتوں میں مردوں کے مقابلہ میں چونتیس ہزار کی زیادتی تھی اور بڑھتی عمر کے ساتھ غیر شادی شدہ عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ چالیس اور چوالیس سال تک پہنچتے پہنچتے ان کی تعداد ۲٬۴۴٬۰۰۰ بن جاتی ہے۔ گویا مردوں کے مقابلہ میں غیر شادی شدہ عورتوں کی کل تعداد ۳۱٬۷۴٬۰۰۰ ہے۔

اس کا یہ مطلب ہوا کہ عورتوں کی ایک معقول تعداد محض خاوندوں کی کمیابی کے باعث کنواری رہنے پر مجبور ہے بعض اصحاب نے کثرتِ ازدواج میں اس کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ مسئلہ کا تشفی بخش حل نہیں ہے۔ سماجی قواعد میں تبدیلی سے کم عمر عورتوں کی تعداد میں تو شاید کمی ہو جائے لیکن زیادہ عمر والیاں اس سے متاثر نہ ہوں گی۔ اور بڑھتی عمر کے ساتھ غیر شادی شدہ کی تعداد میں اضافہ کے رجحان پر قابو نہ پایا جاسکے گا علاوہ ازیں مغربی تہذیب نے محبت، گھر اور ازدواج کے بارے میں جو روایات بخشی ہیں ان کی موجودگی میں نفسیاتی اور ہیجانی لحاظ سے بھی یہ حل تسلی بخش نہیں ثابت ہوسکتا۔

مردوں پر عورتوں کی اکثریت کے سلسلہ میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم اوّل نے جنسوں کا توازن بگاڑنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مثال کے طور پر ضلع لندن میں بیس اور ساٹھ سال کی شادی کے قابل عورتوں کی تعداد ۱۹۱۱ء میں ۱٬۵۲٬۰۰۰ تھی لیکن ۱۹۲۱ء میں یہ تعداد ۲٬۱۷٬۰۰۰ بن چکی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں آنے والے سالوں میں عورتوں کی تعداد میں شدید اضافہ کی توقع رکھنی ہوگی کیونکہ موجودہ دور میں جنگ کے طریقوں میں گو تبدیلیاں پیدا ہو چکی ہیں لیکن پھر بھی جنگ میں ہمیشہ عورتوں کے مقابلہ میں مرد ہی زیادہ مرتے ہیں۔

اس صورتِ حال کا جائزہ بہت دلچسپ ہے اگر مرد شادی نہ کرے تو سیدھی سی بات ہے کہ وہ کسی وجہ سے ایسا نہیں کرنا چاہتا یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ کسی نفسیاتی الجھن کے باعث شعوری یا لاشعوری طور سے وہ شادی سے گریز اختیار کرتا ہے مباشرت اور پدریت کے لیے شدید حیاتیاتی محرکات ہوتے ہیں۔ ایسے اگر ان کے باوجود بھی کوئی مرد شادی نہیں کرتا تو ہم یہ فرض کرنے میں حق بجانب ہیں کہ پہلے گروہ میں نفسیاتی عدمِ مطابقت رکھنے والے بھی کچھ مرد ہوں گے۔ اب خواہ ایسے مرد مذہبی یا جذباتی وجوہات سے شادی نہ کریں یا محض سہولت کے باعث اس سے دور بھاگیں۔ یا کوئی اور وجہ ہی کیوں نہ ہو — بہرصورت یہ کسی خوف یا وابستگی کی بنا پر ایسا نہیں کرتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام غیر شادی شدہ مرد ایسے ہی ہوتے ہیں بلکہ ایسے نارمل، صحت مند اور نفسیاتی مطابقت رکھنے والے مردوں کی بھی کمی نہیں جو تمام عمر تجرد کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان تمام مثالوں کے لیے عمومی اصول وضع کرنے مشکل ہیں۔ نفسیات پر مبنی عمومی اصولوں کی تشکیل اور بھی مشکل ہے زندگی اور اس کے تقاضوں سے مطابقت کا عمل سب سے زیادہ پیچیدگی اور انفرادیت کا حامل ہوتا ہے۔ خارجی حالات اور طرزِ زیست کے لحاظ سے دو افراد میں بالکل یکسانیت مل سکتی ہے۔ لیکن ژرف بینی سے ان کے نفسیاتی مطالعہ پر معلوم ہوگا کہ ایک نے خارجی حالات سے عہدہ برا ہونے کے لیے عقل پر مبنی معقول طریق کار وضع کر رکھا ہے جبکہ دوسرے نے زندگی کے تقاضوں سے گریز کو عقلی جامہ پہنا رکھا ہو۔

جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے تو بلاشبہ نفسیاتی الجھنوں کے باعث شادی نہ کرنے والی عورتیں بھی ملتی ہیں لیکن پھر بھی کثیر تعداد ایسی عورتوں کی نکلے گی جو محض اس بنا پر کنواریاں ہیں کہ بلحاظ تناسب مردوں کی کہیں زیادہ کمی ہے۔ اس لیے کنواری عورتوں کے مسائل کا جائزہ لیتے وقت صرف ان نفسیاتی بواعث سے ہی غرض نہیں رکھی جاسکتی جو بالآخر شادی سے گریز کا سبب بنتے ہیں۔ بلکہ فطری رجحانات کے برعکس پیدا ہونے والی ناگزیر صورتِ حالات اور اس سے متعلق عملی مسائل کا بھی احاطہ کرنا ہوگا۔ مردوں کے سلسلہ میں ہمارا سابقہ صرف نفسیاتی وجوہات سے ہے کیونکہ تجرد کی زندگی میں عقلی اور نفسیاتی لحاظ سے خارجی حالات سے مطابقت پیدا کرنے والا مرد اگر چاہتا تو اپنی عملی اور ہیجانی مشکلات کا شادی کی صورت میں حل تلاش کرسکتا تھا۔

غیر شادی شدہ مرد

آخر مرد شادی کیوں نہیں کرتے؟ حالانکہ عورتوں کے مقابلہ میں ان کا راستہ کہیں سہل ہے انہیں تو صرف انتخاب اور پسند کی تکلیف گوارا کرنی ہے اس سوال کا جواب ہمیں جدید نفسیات ہی دے سکتی ہے۔ یہ درست ہے کہ مالی ذمہ داریاں عورت کے مقابلہ میں ایک مرد کے لیے

شادی کو زیادہ مشکل اور اہم بنا دیتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات لڑکے کی نفسی جنسی نشوونما کچھ اس انداز سے ہوتی ہے کہ اگر وہ ان نفسیاتی مشکلات پر قابو نہ پا سکے تو وہ شعوری اور لاشعوری طور سے اس میں شادی یا صحت مند جنسیت سے خوف پیدا کر دیتی ہے۔ اس خوف اور دیگر نفسیاتی الجھنوں کی تہ اور ماخذ تک پہنچنے کے لیے ہمیں ماں اور بچہ کے ابتدائی تعلقات کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

میں اس موقع پر ایک امر کی وضاحت کرتے ہوئے قارئین سے درخواست کروں گی کہ وہ طفلانہ ہیجانی تجربات کے ضمن میں اسے ہمیشہ ذہن نشین رکھیں کہ یہ سب کچھ بچہ کے لیے واضح اور آشکار نہیں ہوتا یہ زبان اور گفتگو کی نشوونما سے پہلے کی باتیں ہیں۔ بچہ نہ تو اس صورت حال کو صحیح طور سے سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی اس سے وابستہ احساسات کے ابلاغ کے لیے اس کے پاس مناسب اور موزوں الفاظ ہوتے ہیں۔ ہم بچے کے احساسات کی شدت، ان سے وابستہ خوف، اس پر قابو پانے کے لیے اختیار کردہ ذرائع اور ان سب کی تشریح سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے ان بالغ افراد کی تحلیل نفسی کے مرہون منت ہیں جو تحلیل نفسی کی طویل مدت میں ان طفلانہ ہیجانات کے پیدا کردہ بحران سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خاطر ان کے اظہار کے لیے الفاظ تلاش کر لیتے ہیں۔ دراصل جدید نفسیات کی اساس انسانی تجربات پر استوار ہے یہ ایسے نظریات کا نظام نہیں جن کی تشکیل دارالمطالعہ یا تجربہ گاہ میں کی گئی ہو۔

اس تمام مضمون کے دوران ہمیں بار بار عہد طفلی اور اوائل بچپن کے ہیجانی بحرانوں اور تناؤ کا حوالہ دینا پڑے گا۔ کیونکہ بالغانہ زندگی کے ہیجانی اور بالخصوص غیر معمولی اور غیر صحت مند ردّ عمل کے لیے یہی بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔ مرحوم پروفیسر فرایڈ نے جب مردم ریضوں کی تحلیل کی تو اس نے محسوس کیا کہ وہ سبھی بچپن میں ایک خاص قسم کے دور سے گزرتے ہیں اس نے اس کا نام ایڈی پس دور رکھا۔ (یہ لفظ یونانی اساطیر سے ماخوذ ہے یہ اس بیٹے کی داستان ہے جو اپنے باپ کو قتل کر کے ماں سے شادی کرنا چاہتا ہے) اس دور میں لڑکا اپنی ماں کے ساتھ شدید شہوانی لگاؤ کے باعث اپنے باپ کے لیے حسد اور معاندانہ جذبات محسوس کرتا ہے۔ جب فرایڈ کا یہ نظریہ پہلی مرتبہ شائع ہوا تو اس پر شک آمیز حقارت کا اظہار کیا گیا۔ لیکن بتدریج اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا اور ہم میں سے اکثر اس کی سچائی کا لڑکے کے اس بے تکلفانہ فقرہ سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ لڑکا ماں سے کہتا ہے۔ "جب ابا مر جائیں گے تو میں آپ سے شادی کر لوں گا"!

یہ صورت حال بالعموم شدید احساس جرم پیدا کرنے کی موجب بنتی ہے خصوصیت سے اس وقت جب طفلانہ جنسیت (جنسی زندگی کا جز توم) پر تشویش یا مذمت سے قدغن لگائی گئی ہو۔ عموماً لڑکا اس دور سے کامران نکلتا ہے اور جب افراد کنبہ کے دائرے سے باہر وہ مرکز الفت کی تلاش کرتا ہے تو یہ سب کچھ دبا کر بھلا دیا جاتا ہے لیکن اگر اس دور میں وابستگی ہو جائے اور ایسا ہونا کچھ ناممکن بھی نہیں۔ بعض اوقات اس ضمن میں اس میں شدید الجھنیں اور احساس جرم پیدا ہو جاتا ہے۔ ان سب صورتوں میں اس کی ہیجانی نشوونما رک جاتی ہے نتیجہ میں مرکز الفت کی تلاش کے لیے وہ ماں - بچہ - باپ کی مثلث سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس میں مادرانہ وابستگی (یا جیسا کہ ہم بعد میں جائزہ لیں گے پدرانہ وابستگی) پیدا ہو کر اسے شادی کے ناقابل بنا دیتی ہے کیونکہ وہ ماں سے علیحدگی گوارا نہیں کر سکتا۔ وہ یہ کیسے سکتا ہے کہ میرے بغیر میری ماں کی گزر مشکل ہو جائے گی اور یہ ایک لحاظ سے ہے بھی درست کیونکہ اکثر ماؤں کو بیٹوں سے وابستگی ہوتی ہے اور وہ انہیں اپنے سے دور کرنے پر تیار نہیں ہوتیں۔ لیکن عموماً معاملہ اس کے برعکس ہی ہوتا ہے۔

ایڈی پس دور سے وابستگی کا ایک نتیجہ نوجوان مرد کے لیے تمام عورتوں کے "حرام" ہو جانے میں ظاہر ہوتا ہے۔ تمام عورتیں ماں کی قائم مقام ہیں اس لیے ان سب سے جنسی اختلاط ممنوع ہے۔ یہ تحریم کا ایک انداز ہے! لاشعوری محرکات کی بنا پر عموماً ایسے مرد شادی نہیں کر سکتے اور صرف تحلیل نفسی سے ہی لاشعور میں چھپی وجہ دریافت کی جا سکتی ہے۔ عین شادی کے دن روپوش ہونے والے نوجوانوں کے عام واقعات بلکہ خودکشی تک کی تہ میں بھی غالباً یہی وجہ ہوتی ہے۔

سو کنوارے مردوں کی تشکیل میں ایڈی پس الجھن ایک اور طریقہ سے بھی اثر انداز ہوتی ہے دو اور پانچ سال کی عمر کے دوران لڑکے کو اپنے جنسی اعضاء کی موجودگی کا شدت سے احساس ہوتا ہے اس احساس کی بنا پر وہ انہیں قابل قدر سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن بہت سے عوامل۔ بشمولیت ایڈی پس احساسات کا پیدا کردہ احساس جرم۔ اس میں یہ خوف پیدا کرتے ہیں کہ کہیں یہ متاع بے بہا اس سے چھین نہ لی جائے۔ بعض لوگ لڑکوں کو جنسی اعضاء سے کھیلتے دیکھ کر کاٹنے کی دھمکی بھی دیتے ہیں۔ لیکن انہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ بچہ اس دھمکی کو کس روشنی میں لیتا ہے اور وہ اس سے کس قدر پریشان اور خوفزدہ ہوتا ہے۔

ایسے تجربات اور ان کے ساتھ ہی گہرے لاشعوری خوف اور فانتزیاں مل کر کم عمر لڑکے کو جنسی اعضاء کی فکر اور تشویش کے بوجھ تلے لاد دیتے ہیں۔ بلوغت کے بعد یہی فکر اور تشویش اس کے ذہن میں اپنی قوت مردمی کے بارے میں شک وشبہ کے کانٹے بو کر شادی سے خوفزدہ بنا دیتی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اس خوف سے واقف نہ ہو لیکن اس کا اظہار شادی سے گریز کی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔ وہ معاملات الفت میں بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتا۔ نتیجہ میں ان لڑکیوں کو بھی ناامید کرتا ہے جو ایسا طرز عمل پیدا کرنے والی اصلی اور لاشعوری وجوہات سے بے خبر ہوتی ہیں۔ ایسے ہی مرد نیم حکیموں کے شکار اور اشتہاری ادویات کے خریدار بنتے ہیں۔ حالانکہ ان میں کوئی ٹھوس خامی نہیں ہوتی۔ محض خوف ہی خوف ہوتا ہے۔ ایسے نفسیاتی پس منظر سے ابھرنے والے لڑکے ان سماجی گروہوں کے اعلیٰ تصورات اور اونچی قدروں کے سب سے پہلے شکار بنتے ہیں جہاں شراب اور رقص روا ہوتا ہے اور جہاں لڑکی اور عورت میں کوئی تمیز نہیں۔ اگر صحت کے کسی اعلیٰ معیار کو اپنانا ہے تو لڑکوں کو ایسے خراب ماحول کے اثرات سے بچانا لازمی ہوگا۔ زندگی کے ساتھ مطابقت رکھنے والے نوجوان ہی کو صحیح طور سے یہ معلوم ہے کہ "عورت" کسے کہتے ہیں لیکن اپنی ماں سے وابستہ مشوش مرد بحیثیت مجموعی جنس مخالف سے غیر عقلی قسم کا خوف محسوس کرتا ہے۔ بعض اوقات مادرانہ وابستگی کے احساس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مرد طوائف بازی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ اس صورت میں ایک اچھی اور شریف لڑکی کے ساتھ جنسی اختلاط محال ہو جاتا ہے اور یوں تمام جنسیت سے وابستہ احساس جرم اسے جنسی تسکین کے لیے ایسے شعائر اپنانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جنہیں وہ خود بھی قابل مذمت گردانتا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ وہ لاتعلقی یا بے حسی یا سختی کے پردے تلے اپنے احساسات چھپائے رکھے۔

ہم جنس پرستی

ہم جنسیت بھی شادی کے لیے ایک رکاوٹ بن سکتی ہے ہم جنس پرستوں کی بعض اقسام بیان کردہ نفسیاتی صورت حال سے جنم لیتی ہیں۔ مردوں اور عورتوں میں ہم جنس پرستی

کو عمومی طور سے دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلے گروہ میں ایسے مرد (یا عورتیں) شامل ہیں جو مخالف جنس کے انداز پر ہم جنس سے محبت کرتے ہیں اور اس ضمن میں ان کے احساساتِ الفت عام اور نارمل لوگوں ایسے ہی ہوتے ہیں البتہ ان احساساتِ الفت کا مرکز اور ہوتا ہے۔ دوسرے گروہ کی صورت میں "اندازِ الفت" سے فرق پیدا ہوتا ہے اب مرد خود کو مرد نہ سمجھتے ہوئے عورت کی مانند دوسرے مرد کی محبت کا خواہاں اور مرکزِ جذبات بننے کا متمنی ہوتا ہے۔

اصل ہم جنس پرست۔ جن کی جنسی زندگی سراسر غلط راستہ پر ہوتی ہے۔ دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ وہ مرد ہیں جن کے انداز و اطوار اور نیماہت زنانہ ہوتی ہے ایسے مردوں میں پیدائشی لحاظ سے کوئی نہ کوئی مخصوص اور جسمانی وجہ یقینی طور سے ملے گی۔ اتفاق سے ہم جنس پرستوں میں ایسے ہی مرد دیگر مردوں کی نفرت و حقارت اور مذاق کا نشانہ بنتے رہتے ہیں انہیں "ستی" (SSYSIS) اور "پینزی" (PANSY) کہا جاتا ہے۔ یوں تختہ مشق بننے کی سب سے بڑی وجہ جسمانی اور عضوی کوتاہیاں ہیں جن کے لیے وہ کسی پیدائشی لنگڑے کی مانند بود اور بے بس ہوتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ایسے مرد کردار اور جسمانی صحت۔ کے اعتبار سے عموماً فطرت کے قابل قدر نمونے ثابت نہیں ہوتے لیکن ان کا جائزہ لیتے وقت دو حقائق سے چشم پوشی نہ کی جائے۔ اوّل — ان کا جسمانی غیر معمولی پن بعض دیگر مگر نسبتاً غیر اہم جسمانی خرابیوں کے ساتھ بھی معرضِ وجود میں آسکتا ہے۔ طب سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے اور دوم — انکے کردار کی نشو و نما کو ان تمام مخصوص رکاوٹوں اور الجھنوں سے دوچار ہونا پڑا ہو جو ایسے لوگ شروع سے ہی وقتاً فوقتاً دوسروں کی حقارت اور مذاق کا نشانہ بنتے وقت محسوس کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لڑکے کیونکہ بچپن میں لڑکیوں کے کھیل مشغلوں اور کھلونوں سے دل بہلاتے ہیں اس لیے یہ اپنے ہم جنسوں کے لیے تختۂ مشق بنتے رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ کھیل ان کے لیے بالکل فطری ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایسے مردوں میں تخلیقی اپج کے ساتھ ساتھ احساسِ جمال بہت شدید ہوتا ہے اور اپنی ان غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر یہ ہم عصر زندگی میں تخلیقی تجربات کے نت نئے گل کھلاتے ہیں۔

اس کے برعکس پہلے گروہ سے تعلق رکھنے والے ہم جنس پرست مرد نارمل محبت اور شادی کے اہل ہیں حالانکہ دوسرے گروہ کے مردوں کی خلقی خامیاں ان کے لیے مشکلات پیدا کرتی ہیں لیکن پہلے گروہ کے مرد نفسیاتی مشکلات کے ہاتھوں غیر معمولی تصورِ الفت اپنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جسمانی ساخت کے اعتبار سے یہ دوسرے گروہ کے مردوں سے بالکل برعکس ہوتے ہیں۔ عموماً ان میں مردانہ پن کی تمام صلاحیتیں ملتی ہیں۔ لیکن ان کی محبت کے مرکز لڑکے اور صرف لڑکے ہوتے ہیں اور وہی ان میں جنسی اور رومانی جذبات ابھار سکتے ہیں۔ ان کی صورت میں بھی ہمیں آختگی کا لاشعوری خوف ملتا ہے۔ بچپن میں یہ دہشت ایسی شدید ہو سکتی ہے کہ اس کے بعد سے وہ بغیر ذکر والی ہر ہستی سے دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔ ایسے افراد کو اپنی دہشت کا شعوری احساس نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باعث وہ لڑکیوں کی بجائے لڑکوں میں جنسی کشش محسوس کرتے ہیں کیونکہ ان کے پاس عضو مخصوص کی موجودگی آختگی کے (لاشعوری) خوف سے نجات دلاتی ہے۔ اپنی محبت میں یہ — لڑکیوں کے لیے عام مردوں کی محبت کی مانند — لڑکوں کا پیچھا کرتے ہیں، انہیں رومانی خیالات کا مرکز بناتے ہیں اور ہر طرح سے ان کا من پرچاتے ہیں۔ لڑکوں کے لیے ایسی محبت کا شعوری لحاظ سے جنسی احساسات پر مبنی ہونا ضروری نہیں۔

ہمیشہ کے لیے مجردانہ زندگی اپنانے والے مردوں کی جنسی شخصیت کی تشکیل میں جن نفسیاتی عوامل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ گو ان پر تفصیل سے روشنی نہ ڈالی جا سکی اس لیے یہ سب عمومی اور غیر واضح معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن جب انفرادی مثالیں لی جائیں تو پھر ہر بات قطعی طور سے بیان کی جا سکتی ہے۔ نفسیاتی اقسام کے لحاظ سے مردوں کی قطعی حد بندی نہیں کی جا سکتی ہے۔ شادی نہ کرنے والے مرد کا مسئلہ نفسیاتی لحاظ سے عموماً انفرادی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس کا حل نفسیاتی مطابقت میں تلاش کیا جا سکتا ہے اور یہاں نفسیاتی معالجاتی طریقوں کے ماہر سے رجوع کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس مشکل کی تشکیل میں خارجی حالات کا اثر برائے نام ہوتا ہے۔

سدا بہار کنواریاں

اب ہم غیر شادی شدہ عورت۔ جس کے مسائل جداگانہ نوعیت رکھتے ہیں۔ کا جائزہ لیں گے۔ غیر شادی شدہ عورتوں کی تعداد اس قدر بڑھ چکی ہے کہ اب یہ اچھا خاصا سماجی مسئلہ بن چکا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ابھی تک اس مسئلہ کو باقاعدگی سے دیگر سماجی مسائل کی مانند تسلیم نہیں کیا گیا ہر کنواری کی انفرادی لحاظ سے کوئی نہ کوئی نفسیاتی الجھن بھی ہے اور جیسے کہ آگے چل کر واضح ہوگا ان میں سے بہت سی عورتیں غیر شادی شدہ مردوں ایسی نفسیاتی الجھنوں کے باعث شادی نہ کر سکی ہوں گی۔ لیکن عدم مطابقت رکھنے والی عورتوں کے ساتھ ساتھ لاتعداد ایسی عورتیں بھی ہیں جو محض نسوانی آبادی کے تناسب میں زیادتی کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تنہا زندگی گذارنے کی سزا برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ ایسی عورتوں میں — مردوں کے برعکس — پژمردگی اور محرومی کے احساسات بذاتِ خود ہیجانی چپقلش اور جذباتی انتشار پیدا کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پختہ طبع اور ذمہ دار عورتوں کی کثیر تعداد جو معاوضہ یا بلا معاوضہ کام اور ملازمت سے معاشرہ اور قوم کی خدمت کر سکتی ہے۔ ایسی زندگی گذارنے پر مجبور ہوتی ہے جو کم از کم ایک عورت کے لیے صحت مند اور فطری نہیں ہوتی. کیونکہ اسے تو رفیقِ حیات بن کر بچوں کی پیدائش اور تربیت کرنی ہوتی ہے۔ ادھر پختہ عمر کی غیر شادی شدہ عورت کو بلا وجہ نظرِ استہزاء سے دیکھنے کا رواج سا پڑ چکا ہے. اس کے برعکس اکثر خامیوں کے باوجود بھی ایک سدا بہار کنوارا مرد سب کو اچھا لگتا ہے اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیئے کہ اس غلط روایت کی ذمہ داری بھی ایک حد تک عورتوں ہی پر عائد ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں تو اس نے اچھی خاصی اذیت دہ صورت اختیار کر لی ہے اب اسے ختم کرنے کا وقت آگیا ہے۔

عنفوانِ شباب سے آگے نہ بڑھنے والی عورتیں

نفسیاتی عدم مطابقت رکھنے والے مردوں کے مقابلہ میں نفسیاتی عدم مطابقت کے باعث غیر شادی شدہ رہنے والی عورتوں کی مثالیں نسبتاً عام ہیں۔ خصوصیت سے یہ ملازمت پیشہ عورتوں کے بارے میں زیادہ صحیح ثابت ہوتا ہے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ اس طبقہ کی لڑکیاں نسبتاً گھٹے ہوئے ماحول میں پروان چڑھتی ہیں اور کچھ اس پیچیدہ ہیجانی نشو و نما کے باعث جو لڑکیوں کے لیے کچھ ناگزیر سی معلوم ہوتی ہے۔

اس پیچیدگی کا باعث غالباً یہ حقیقت ہو سکتی ہے کہ لڑکا اور لڑکی دونوں ہی پہلے اپنی ماں سے تخفی اور گہرا رابطہ استوار کرتے ہیں لڑکا تو ماں کی جنس سے تعلق رکھنے والی کسی اور لڑکی سے شادی کر لیتا ہے جب کہ لڑکی جنسِ مخالف کے ایک فرد سے مباشرت

ل؎ خوش رنگ پھولوں والے پودے کا نام ۔ مترجم ۔

کرنے پر مجبور ہوتی ہے ۔ گو ابھی عورتوں کی ہیجانی نشوونما کے بارے میں ہمیں بہت کچھ جاننا ہے ۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ لڑکی اپنی اوّلیں بچگانہ محبت سے رشتہ توڑنے پر مجبور ہوتی ہے گو یہ بھی اچھی خاصی مشکلات سے معمور مرحلہ ہے لیکن ناگزیر ہے کیونکہ پختگی حاصل کرنے کے بعد بیوی اور ماں بن کر اپنے کردار کی ادائیگی کے لیے یہ ضروری ہے بہت سی عورتیں نفسی جنسی پختگی کی نشوونما کے دوران یہ آخری قدم نہیں اٹھا پاتیں ۔ ایسی عورتیں ایک حد تک عنفوانِ شباب کے دور سے آگے نہیں بڑھ سکتیں گو اس سے ان کی دیگر مفید خدمات پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔

آیئے ! اب اس طرح کی رکاوٹ والی ہیجانی نشوونما کی ایک مخصوص مثال کا جائزہ لیں لڑکے کی مانند لڑکی کے لیے بھی ماں شخصی رابطہ کا اوّلیں مرکز بنتی ہے ۔ وہ بچہ کو خوراک دیتی ہے اور اس کے آرام کا خیال رکھتی ہے لیکن یہی ہستی خوراک کے لیے اسے منتظر بھی رکھتی ہے جسمانی عادات پر قابو کا مطالبہ کرتی ہے ، بعدازاں وہ اس کے لیے کرداری معیار کی تشکیل کرتی ہے ، وہ اتلذاذی حرکات میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے اور پسندیدہ اشیاء کے درمیان دیوار بن کر حائل ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ ـــ یہ سب کچھ ماں کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن بچی کا تو ہیجانی سرمایہ ہی یہی کچھ ہوتا ہے ماں کے ساتھ یہ جنگ ہیجانی انتشار کا باعث بنتے ہوتے ماں بچی کے باہمی رابطہ میں پیچیدگیاں پیدا کرتے ہوئے شخصیت پر گہرے اثرات چھوڑتی ہے ۔ ایسے اثرات جن کی بازگشت عمر کے کئی ادوار تک سنی جاسکتی ہے ۔ لڑکا بھی ان سب ہیجانی پریشانیوں سے دوچار ہوتا ہے لیکن لڑکی ان سے زیادہ متاثر ہوتی ہے ، اس کے لیے یہ کشمکش زیادہ شدید ہوتی ہے اور اسی لیے زیادہ شدید دباؤ سے کام لینا ہوتا ہے ۔

یہ درست ہے کہ ابھی مسئلہ کے بہت سے پہلو غیر واضح ہیں لیکن جیسے کہ گذشتہ سطور میں بیان کیا جاچکا ہے یہ فرق غالباً اس وجہ سے ہوتا ہوگا کہ لڑکے کے مقابلہ میں لڑکی نے اپنی مکمل اور کامیاب نفسی جنسی نشوونما کے لیے مادرانہ رابطہ کو کُلّی طور سے ختم کرنا ہوتا ہے اس ناقابل برداشت صورتِ حال کے باعث دباؤ کا عمل بڑا شدید ہوتا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے ہمیں یہی سمجھ لینا چاہیئے کہ بچہ مٹھی بھر وجود کی وجہ سے کتنا بے بس اور اعصابی لحاظ سے غیر متوازن ہوتا ہے (جس کی دانت نکالنے کی معمولی سی تکلیف سے بھی بری حالت ہوجاتی ہے) جب چھوٹی بچی غصہ میں ہوتی ہے تو وہ اپنے سے زیادہ قوی قوتوں کے رحم وکرم پر ہوتی ہے ۔ ایسی قوتیں جن پر اسے کوئی قابو نہیں ۔ شدید کپکپی سے ٹانگیں اور بازو ہلتے ہیں اور حلق میں دم گھوٹنے والے انداز سے پھندا سا پڑ جاتا ہے ۔ یہ غصہ ایک دہشت ناک عفریت کی صورت میں گویا خارج سے اس پر حملہ آور ہوتا ہے اور بقائے زیست کے لیے اس پہ قابو پانا لازمی ہے ۔ فانتزی کی یہ عفریت دباؤ کا آلہ بنتے ہوئے ایک تخریبی اور تعزیراتی قوت کی صورت اختیار کرلیتی ہے بچہ کی خوفناک فانتزیوں اور جبلتوں سے معرضِ وجود میں آنے والے اس آلہ کو تحلیل نفسی کی اصطلاح میں غیر متمدن فوق الانا کہتے ہیں ۔ بعدازاں والدین کے تصورات ومعائر کی روشنی میں اس کی نشوونما اور حدود متعین ہوتی ہیں ۔ یوں یہ کردار کے لیے ایک شعوری الانا کی صورت اختیار کرلیتی ہے لیکن بچوں اور بالخصوص لڑکیوں میں جن کا عہدِ طفلی طوفانوں اور حوادث سے پُر ہوتا ہے ــ غیر متمدن فوق الانا زندگی میں امتناعی اور مطالبہ کُن لحاظ سے سرگرمِ عمل رہتی ہے ۔

عہدِ طفلی سے گزرنے کے بعد اب لڑکی باپ کی صورت میں ایک نیا رابطہ پیدا کرتی ہے یوں باپ اس کی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے ۔ لڑکے کے ایڈی پس حدد سے مشابہ لڑکی بھی ایک ایسے ہی دور سے گذرتی ہے کیونکہ اس دور میں وہ اپنے باپ کے لیے زبردست کشش محسوس کرتے ہوئے ماں سے حسد کرتی ہے ۔ لڑکے ہی کی مانند وہ بھی اس الجھن سے نجات پانے کے لیے اپنی ماں پر زیادہ سے زیادہ انحصار شروع کردیتی ہے ۔ وہ اس کے ساتھ اپنا رابطہ زیادہ سے زیادہ گہرا کرتی جاتی ہے تاکہ وہ اس کی زندگی سے نہ جاسکے بالفاظِ دیگر یہ بھی مادرانہ وابستگی ہی کا ایک انداز ہوا !

اگر باپ اس کے جذبات واحساسات کے معاملہ میں کٹھور ثابت ہو ۔ اور وہ یہ سمجھے کہ اس نے میری محبت کو ٹھکرا دیا ہے تو وہ اپنے مجروح جذبات کے ردّعمل سے خود کو بچانے کے لیے اپنے باپ جیسی بننے کی کوشش کرتی ہے کیونکہ وہ اسے حاصل نہیں کرسکتی اس لیے وہ ہر ممکن طریقہ سے اس کی خصوصیات اپنانے کی کوشش کرتے ہوئے من تو شدی کی سی کیفیت طاری کرلیتی ہے اس لیے وہ اپنی ماں سے والہانہ محبت کرتی ہے کیونکہ بظاہر اس کا باپ بھی اس سے محبت کرتا ہے ۔ ایسے لاشعوری ردّعمل کے باعث شعوری زندگی میں کسی مرد کو بحیثیت محبوب اپنانا ناممکن نہیں رہتا کیونکہ اب باپ کے لیے اس کی محبت مجرمانہ احساسات سے ملوث ہوجاتی ہے یہ اور باپ کی ذات سے تعلق مل کر بعد میں عورت کے دل میں مردوں کے بارے میں خوف وغیرہ ہی نہیں پیدا کرتے بلکہ بعض صورتوں میں تو وہ زندگی میں مردانہ پیشوں یا کردار کو ترجیح دیتی ہیں ۔ موخرالذکر رجحان بعض اوقات اس صورت میں بھی پیدا ہوتا ہے یا زیادہ قوی صورت اختیار کرجاتا ہے کم عمر لڑکی ـــ اپنے اور دوسرے لڑکوں میں بنیادی فرق محسوس کرتے ہوئے لڑکا بننے کی آرزو کرتی ہے یا وہ سمجھتی ہے کہ وہ تو لڑکا تھی ۔ لیکن آختگی کی وجہ سے وہ مردانگی کی نشانی گنوا بیٹھی ہے ۔ بعد کے تجربات اس خواہش کو اور بھی قوی کرتے ہیں کیونکہ بعض گھرانوں میں (اور پاک وہند کے گھرانوں میں تو اور بھی زیادہ) لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دی جاتی ہے (مائیں عموماً ایسا کرتی ہیں) ویسے بھی لڑکیوں کے مقابلہ میں لڑکے زیادہ آزادی اور خوش وقتی سے زندگی بسر کرتے ہیں ۔

اگر اس انداز کی نشوونما کے ساتھ ساتھ لڑکی کو بلوغت اور مادریت کے تقاضوں سے روشناس کرانے کے لیے چنداں کوشش نہ کی جائے تو جسمانی پختگی کی علامات اس کے لیے ایسی اچانک ثابت ہوتی ہیں کہ اس کے لیے اپنے عورت پن کو تسلیم کرنا ہی مشکل ہوجاتا ہے ۔ نتیجہ میں وہ خوف یا کراہت محسوس کرتی ہے ۔ ایسی لڑکیوں کے لیے آغاز شباب الجھنوں اور پریشانیوں کا دروا ہونے کے مترادف ہوتا ہے جنس مخالف کا خوف اور بڑی عورتوں سے شدید جذباتی لگاؤ ــــ مادرانہ وابستگی کے اظہار کی ایک صورت ــــ اس دور کی اہم خصوصیت ہوتی ہے ۔

ایسے تجربات کے اثرات کیونکہ دبا دیئے جاتے ہیں اس لیے اکثر لاشعوری رہتے ہیں ۔ اسی پر مزید اضافہ اور کردینا چاہیئے کہ بعض اوقات ماں یا دیگر افرادِ کنبہ ـــ ایسے لوگ جو لڑکی کی نظر میں کچھ اہمیت رکھتے ہوں ــــ کے جنس کے بارے میں غلط خیالات اور اسے گندہ اور مردود قرار دینے کی وجہ سے بھی لڑکی کی نفسی جنسی نشوونما عنفوانِ شباب کے وقت تعویق میں پڑ جاتی ہے ۔ اس صورت میں لڑکوں کے لیے کشش خطرناک اور قابل مذمت گردانی جاتی ہے ۔

ـــ یہ ہے ان عورتوں کا نفسیاتی پس منظر ، جو معاملاتِ الفت میں ہمیشہ عنفوانِ شباب کے درجہ سے آگے نہیں بڑھ سکتیں ۔ دیگر امورِ زیست میں مہارت یا بالغانہ اندازِ نظر کے باوجود بھی ایسی عورتیں محبت کی دنیا میں ناپختہ ہی رہتی ہیں ۔

ہوسکتا ہے آپ میں سے بعض حضرات یہ سمجھتے ہوں کہ عہدِ طفل میں نفسیاتی نشوونما

کا ضرورت سے زیادہ تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے دراصل اس ضمن میں ہم موجودہ تحقیقات اور بڑھتی ہوئی نفسیاتی ژرف بینی کے مرہونِ منت ہیں جن کے باعث غیر شادی شدہ افراد کی مخصوص مشکلات کو اب سمجھا جا سکتا ہے یہ ادھیڑ عمر کی غیر شادی شدہ عورتوں کے بارے میں خصوصیت سے درست ہے۔ کیونکہ اب ہم یہ جان چکے ہیں کہ ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جو کبھی بھی ذہنی لحاظ سے اس بلوغت تک نہ پہنچ سکیں جو کامیاب ازدواجی زندگی کے لیے لازمی ہوتی ہے۔

معاشقے

آیئے! اب ہم ادھیڑ عمر کی غیر شادی شدہ عورت کی جنسی زندگی کا جائزہ لیں۔ کیا ان عورتوں کو ہر طرح کے جنسی تجربات سے ہاتھ دھو لینے چاہئیں؟ اور کیا وہ واقعی ہاتھ دھو لیتی ہیں؟ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ غالباً کنواری عورتوں کی کثیر تعداد جنسی تجربات سے روشناس ہوتی ہے اب یہ دوسری بات ہے کہ سہیلیوں یا رشتہ داروں کو علم نہیں ہونے پاتا۔

یہ ٹھیک ہے کہ بظاہر تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثریت کو جیسے کبھی جنسی تجربہ کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی اور وہ ان کے بغیر گزارا کیے جاتی ہیں (میری مراد کسی مرد سے جنسی اختلاط ہے)، ہم نے جن عورتوں کے بارے میں یہ کہا ہے کہ وہ ہمیشہ عنفوانِ شباب کے درجہ تک ہی رہتی ہیں ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جنہوں نے بظاہر کبھی بھی جنس کی احتیاج محسوس نہیں کی۔ انہوں نے جنسی زندگی کو جن اعلیٰ معاشرے سے وابستہ کیا ہوتا ہے وہ اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خواہشات پر قابو پاتے ہوئے وہ خود کو جنسی تجربہ سے محروم رکھتی ہیں۔ ان کی زندگیوں میں کام اور مختلف النوع دلچسپیوں اور دوستیوں سے گہما گہمی رہتی ہے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی جنسی جبلت — جو غالباً کبھی بھی اتنی قوی نہیں ہوتی — مکمل طور سے ارتفاع پا چکی ہے۔ ایسی عورتیں معاشرہ کے لیے بہت زیادہ سودمند ثابت ہوتی ہیں اور اس کے لیے ہمیں اس ہیجانی نشوونما کا مرہونِ منت ہونا چاہیئے جو انہی مشکلات نسے پُر اس دنیا میں جینے کا قرینہ سکھائی۔ محققین، استانیوں، سماجی کارکنوں، معالجین نرسوں اور بہت سے دیگر پیشوں میں اپنی محنتِ شاقہ اور معاملہ فہمی کی وجہ سے یہ معاشرہ کی بہبود کے لیے غیر معمولی طور سے مفید ثابت ہوتی ہیں۔ ایسی عورتوں کے بغیر آج کی سماجی زندگی میں ابتری اور پریشانیوں کا دور دورہ ہو۔ بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ عورتیں یکسانیت رکھنے والے کاموں کے لیے ہی موزوں ہیں۔ لیکن اسے تسلیم کرنا بے انصافی نہ ہوگی کہ خوش قسمتی سے ایسی عورتیں ان یکسانیت رکھنے والے کاموں میں جس محنت اور جان کاہی سے اپنے آپ کو منہمک کر دیتی ہیں۔ یہ وہی محنت ہے جو عام حالات پر گھریلو زندگی میں صرف ہوتی۔

انہیں محنت سے معاشرہ کی بہبود کے لیے کوشاں رہنے والی ایسی تمام عورتیں ہی جنسی لحاظ سے خام نشوونما والی نہیں ہوتیں۔ ایسی عورتوں کے معاشقوں کا کیا کیجیے جو مکمل نفسی جنسی نشوونما کے باعث خاوند اور بچوں کی تمنا کرتی ہیں؟ کیا ایسی عورتوں کو قلیل یا طویل مدّت کے لیے کسی کی داشتہ بن جانا چاہیئے — کیا اسے عشق کہا بھی جا سکتا ہے؟ کیا اس کی اجازت ہونی چاہیئے —؟ اور اگر اسے جائز سمجھا بھی جائے تو کیا یہ اس مشکل کا حل ہو بھی سکتا ہے؟

گذشتہ سالوں میں ایسے امور کے بارے میں اندازِ فکر میں تبدیلی ہوئی ہے اس کی وجہ سے موجودہ دَور میں اسے جائز قرار دینے پر نظریاتی اختلافات کی کافی گنجائش ہے۔ ملکہ وکٹوریہ کے انگلستان میں جنس بنیادی طور سے شیطانی چیز اور شر انگیز سمجھی جاتی تھی۔

لیکن ذہنی کشادگی اور صاف گوئی کے اس دَور میں اکثر مفکرین نے یہ اندازِ نظر مسترد کر دیا ہے گویا غیر ازدواجی جنسیت کو مردود قرار دینے کے لیے (اگر واقعی اس کی ضرورت ہے) ہمیں کسی اور اصول کو تلاش کرنا ہوگا۔

غیر ازدواجی جنسی تعلقات سے وابستہ ذہنی اور سماجی الجھنیں سبھی عورتوں پر یکساں طور سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ کم عمر اور نوجوان لڑکیوں سے قطع نظر ان عورتوں کو دیکھیں جن کی پختہ عمری نے انہیں شادی سے ناامید کر دیا تو صورتِ حال پر مزید غور و خوض کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ذاتی نقطہ نظر سے ہٹ کر نفسی جنسی پختگی اور نفسی جنسی ناپختگی کے مقابلہ کا بھی ایک اصول ہے۔ نفسیات کے بموجب پختگی حقیقت سے مطابقت کا نام ہے جنسی زندگی میں پیش آنے والے حالات کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے زیادہ سے زیادہ بہتر انداز سے متمتع ہوا جائے۔ علاوہ ازیں ذاتی تعلقات — جن میں جنس پر مبنی جسمانی تعلقات بھی آ جاتے ہیں — کو خوشگوار طریقہ سے استوار اور مستحکم رکھنا بھی دلیلِ پختگی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ محض خواہش ہی جنسی تعلقات کی استواری کے لیے معقول جواز نہیں بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ یہ مسئلہ بہت الجھا ہوا ہے اور کئی ذاتی اور سماجی الجھنوں کی جنم دہی کا باعث! ایک عورت محبت اور جسمانی کشش کے لحاظ سے کسی مرد کو پسند کرتے ہوئے اس کی خواہاں ہو سکتی ہے وہ اسے اپنا محبوب بنانا چاہتی ہے لیکن کئی ایسے خارجی عوامل ہیں جن سے وہ آنکھیں بند نہیں کر سکتی۔ مثلاً پیشہ ورانہ شہرت یا قیامِ حمل کو کیسے ذہن سے فراموش کیا جا سکتا ہے!

یہ مسئلہ اس وقت اور بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے جب ایسے جنسی تعلقات کے لیے منتخب کردہ مرد شادی شدہ ہو۔ اب اس کی بیوی اور بعض صورتوں میں بچوں کا کیا بنتا ہے! مضبوط اور متوازن کنبہ معاشرہ کی بقا کے لیے لازمی ہے۔ اگر وسیع پیمانہ پر غیر ازدواجی تعلقات کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے کنبہ کا شیرازہ بگڑ جائے گا۔ کیونکہ ایسے تعلقات سے شادی شدہ فریق کی کنبہ کے بارے میں ذمہ داریاں ختم نہیں ہو جاتیں۔ اصولاً سبھی شادی شدہ افراد کو غیر ازدواجی تعلقات کی استواری کے لیے کھلی چھٹی دے دیں تو اس کے نتیجہ میں افراد کا کردار جو صورت اختیار کر جائے گا اس کے باعث شادی کی مجموعی طور سے غیر محفوظ بن جائے گی جس کے نتائج خصوصیت سے بچوں کو بھگتنے پڑیں گے۔

مزید برآں اگر اس مسئلہ کا نفسی بنیادوں پر جائزہ لیں تو کیا اتنے خطرات اور مشکلات کے بعد حاصل شدہ — اور عظیم تمنا پر مبنی — مکمل جنسی تعلقات اس تمام دردِ سر کے قابل بھی ہیں؟ کیونکہ چوبیس گھنٹہ کا ساتھ تو ناممکن ہے زیادہ سے زیادہ چوری کی ملاقاتیں اور ہفتہ اتوار کا ساتھ ہے؟

یہ سب کچھ قطعی نہیں کیونکہ امکانات کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ بھی ہو سکتا ہے جو ان تمام سوالات کو بے معنی ثابت کرتے ہوئے عاشق و معشوق کے حق میں فیصلہ صادر کر دے۔ لیکن ایسی ہر ممکنہ صورتِ حال کا ان مخصوص حالات کی روشنی ہی میں جائزہ لیا جا سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ امکانات کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ یقینی طور سے صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وہ تمام جنسی تعلقات جن کا آغاز غیر ذمہ داری یا غیر دانشمندی سے کیا جائے بلکہ اگر سوچ سمجھ کر اور صرف تجربہ کی خاطر بھی یہ کیا جائے تو ایسے تعلقات اپنے جلو میں صرف سماجی پریشانیوں ہی نہیں لائیں گے بلکہ جب سنہرے خوابوں کا محل چکنا چور ہو گا تو فرد خود سے متنفر ہوتے ہوئے، "آئیں دفتر بے معنی!" پکار اٹھے گا۔ یہ ان لڑکیوں کے لیے بالخصوص درست ہے جنہوں نے اپنی تربیت کے ضمن میں قدیم روایات کا جوا ابھی ابھی اتار کر پھینکا ہو۔

نفسیاتی لحاظ سے "کرخت مزاج" ثابت ہونے والی بعض عورتیں ایسی بھی ہیں جو صرف تجربہ کی خاطر معاشقہ کا آغاز کرتی ہیں اور کسی پژمردگی یا مشکل کا سامنا کیے بغیر اسی تجربہ میں کامیاب ہوتی ہیں بلکہ بعض اوقات تو وہ اسے عزتِ نفس میں اضافہ کا باعث بھی بنا لیتی ہیں کہ اب انہیں نارمل جنسی تجربات کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ اس خود آسودگی کے لیے انہیں قابلِ ملامت یا موردِ الزام ٹھہرانے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن اتنا یقینی ہے کہ بحیثیت معاشقہ یہ ان کے لیے چنداں اہمیت کا حامل نہ تھا۔ پھر بعض ایسی عورتیں بھی ملتی ہیں جو محبت میں پیش آنے والی افتاد سے واقفیت کے باوجود بھی پرجوش طریقہ سے آغاز الفت کرتی ہیں۔ تمام مشکلات اور پریشانیوں بلکہ آخری جدائی کی تکلیف پر قابو پا لینے کے باوجود بھی وہ محبت کے زریں لمحات کی یاد اپنے ذہن سے خارج نہیں کر سکتیں۔ ایسے افراد کے بارے میں ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ یہ اپنی زندگی کا راستہ سوچ سمجھ کر متعین کرتے ہیں اور پھر تحمل اور مستقل مزاجی سے اس پر گامزن بھی رہتے ہیں۔ اگر وہ پہلے سے بالغ نہ ہوں تو اب وہ ذہنی بلوغت کی منزل پا لیتے ہیں اور ہم نفسیاتی یا کسی اور وجہ سے ان کے طرزِ عمل پر انگلی اٹھانے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

اس کے خلاف ایک اور طرف سے بھی آواز بلند کی جا سکتی ہے؟ کیا ہم اسے ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہے؟ آخر ایک ایسا نقطۂ نظر بھی تو ممکن ہے جس کی وجہ سے محض ذمہ داریوں میں کمی کے باعث ایسے معاشقوں کو شادی پر ترجیح دی جائے۔ اس نقطۂ نظر کے حامیوں کا کہنا ہے کہ سارا لطف ہی اس میں ہے اور عورتوں کو یہ حق پہنچنا چاہیے کہ جس مقصد کے لیے ان کے جسم بنائے گئے تھے ۔۔۔ وہ یہ سب کچھ کر گزریں!

ایسے نظریات و خیالات کی حامی عورتیں محض اپنی بچگانہ ذہنیت کی بنا پر ہر بھنورے کے لیے دعوتِ نظارہ بنی رہتی ہیں ان کے ایسے معاشقے دیگر پختہ طبع سہیلیوں کے سامنے ان کی کم مائیگی کا بھانڈا پھوڑ دیتے ہیں ہم یہاں حماقت کا لفظ استعمال نہیں کرتے لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ ایسے تجربات کے باوجود بھی ان کی ہیجانی نشو و نما رکی رہتی ہے محبت میں اس صورت سے بہ شخصیت تشکیل پاتی ہے جب وہ مخصوص فرد ہیجانی نشو و نما کی منزل میں ہو کیونکہ اس صورت میں جنسی تجربہ شخصیت کے لیے مہمیز کا کام کرتے ہوئے حصول پختگی میں ممد ثابت ہوتا ہے ایک بالغ اور بالغ نظر فرد کے لیے محبت ایک کھلونا نہیں بلکہ وہ حقیقی محبت کا طالب ہوتے ہوتے مکمل تعلقات کا خواہاں ہوتا ہے اسی لیے وہ راہ وفا پر چلنے والے دو چار بہت سخت مقامات سے گھبراتا نہیں۔

تشادد۔ ہوش اور محرومی کے زمانوں ۔۔ جیسے زمانہ جنگ ۔۔۔ میں ایسے غیر ذمہ دارانہ معاشقوں کی کثرت ہو جاتی ہے لیکن ایسے معاشقوں کے لیے جنگ کی عطا کردہ دلکشی اور رومانیت بالکل عارضی اور مصنوعی ثابت ہوتی ہے اور یوں یہ بلحاظ گہرائی زمانہ امن کے گھٹیا اور بازاری معاشقوں ہی کی ذیل میں آجاتے ہیں۔

معاشقوں کا تذکرہ ختم کرنے سے پہلے عمومی دلچسپی کے دو امور پر روشنی ڈالنی موزوں معلوم ہوتی ہے۔ مرد اور عورت دونوں ہی کے لیے معاشقے جداگانہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اگر جنسی تجربہ صرف جنسی اختلاط تک ہی محدود ہے تو عورت کے لیے ایسا تجربہ نامکمل اور خام ہے۔ قیامِ حمل، بچہ کی پیدائش اور بعد ازاں اسے دودھ پلانا یہ سبھی نسائی زندگی کے اہم شعبے ہیں لیکن ناجائز تعلقات یا ایسے معاشقوں میں اول الذکر سب لازماً خارج کر دیئے جاتے ہیں ورنہ ناپسندیدہ تو ضرور ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے ایک نارمل عورت ایسے تعلقات میں ہمیشہ ایک حد تک تشنگی سی محسوس کرتی رہتی ہے ایسے معاشقوں اور ناجائز تعلقات کے ضمن میں یہ امر ہمیشہ پیشِ نظر رہے خواہ ایک پختہ عمر کی عورت ہی کیوں نہ ہو!

مزید برآں عورت کے لیے محبت محدود اور "مقامی" نوعیت کی نہیں ہوتی۔ محبت میں ۔۔ بشرطیکہ سچی محبت ہو ۔۔۔ جسمانی تعلقات کی صورت میں صرف اس کا جسم متاثر نہیں ہوتا بلکہ اس کی تمام زندگی ہی دل کے رنگ میں رنگی جاتی ہے شاید اس وجہ سے عورتوں کی اکثریت ابتدائے عشق میں آگ ہوتی ہے اور اعتماد و انبساط کی تصویر۔ لیکن انجام عموماً پژمردگی، یاس اور پہلے سے بھی بڑھ کر احساسِ تنہائی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایسے معاشقوں میں مرد اور عورت محفوظ رہ کر حقیقی زندگی بسر کرنے سے قاصر ہوتے ہیں جب کہ عورت ہمیشہ محبت میں تحفظ اور دوام کی خواہاں ہوتی ہے ۔۔۔ عورت کی شخصیت کا یہ ایسا پہلو ہے جسے مرد صحیح طور سے نہیں سمجھ سکتے۔

عورت کے برعکس مرد کے لیے محبت ۔ جسمانی اور ہیجانی ہر دو لحاظ سے ہی "مقامی" اور محدود رہتی ہے بلکہ مردوں کی اکثریت نے تو ۔۔۔ کسی طرح کا ہیجانی انتشار محسوس کیے بغیر ۔ محبت اور جنس کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں مقید کر رکھا ہوتا ہے جب کہ ایک نارمل عورت کے لیے یہ ناممکنات میں سے ہے مرد اور عورت کے درمیان اس اہم تفریق کو سمجھ لینے کے بعد (اس کی ایک وجہ عورت کی نفسی جنسی نشو و نما کی پیچیدگی بھی ہو سکتی ہے) ہم اخلاقی دوغلے پن اور کرداری دو عملی کی تہ تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ جب آزادئ نسواں کی تحریک کے علم برداروں نے ایک معیار پہ زور دیا تھا تو ان کے ذہن میں یہی تھا کہ مردوں کو عورتوں کا روایتی معیار اپنانا چاہیے تاکہ عورتیں مردوں کی روایتی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کریں یہ مسئلہ عورت کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے کیونکہ جنس اور محبت کے امتزاج اور اشتراک کا مطلب ایک نئے وجود کو دنیا میں لا کر ابتدائی مہینوں میں اس کی نگہداشت کرتا ہے وہ ابتدائی مہینے ۔ جن پر اس بچہ کے مستقبل کا انحصار ہے۔

خود لذتی

محبت اور معاشقوں کی عام صورت میں جنس کے اظہار کا عام طریقہ دیگر افراد سے رابطہ ہے لیکن دیگر افراد کی عدم موجودگی میں بھی جسمانی جنس اپنی موجودگی محسوس کرا سکتی ہے۔ عورتوں کی جنسی زندگی میں ایک آہنگ ملتا ہے جسے عموماً گردشِ حیض کے آہنگ سے تشبیہ دی جاتی ہے اور اس سے عموماً اس کا رشتہ بھی استوار کیا جاتا ہے۔ جنسی خواہش کا پھوٹنا ایک جسمانی اور ٹھوس وقوعہ ہے اور اپنی وقوع پذیری کے لیے کسی محبوب جنس کے جادو کا منتظر نہیں ہوتا۔ اس کی وقوع پذیری میں خیالات و تصورات خاصہ نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں غیر شادی شدہ عورت کو کیا کرنا ہے؟

بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی کیونکہ یہاں بھی پختہ اور خام نفسی جنسی نشو و نما اپنے مخصوص رنگ بکھیرتی ہے۔ کم عمر لڑکی جلق یا خود لذتی کے وقت ان کے جنسی مفہوم سے عموماً ناآشنا ہوتی ہے لیکن اگر اسے سختی سے منع کیا جائے ۔۔۔ یا بعض زیادہ گہری وجوہات کی بنا پر اس میں خود بخود ہی احساسِ جرم پیدا ہو جاتا ہے ۔۔۔ اس صورت میں وہ تمام عمر ان کے چکر سے نہ نکل سکے گی۔ ایسے ذہنی پس منظر سے تعلق رکھنے والی عورت جب وقت بے وقت جنسی بیداری کے بعد خود کو یوں آسودگی بہم پہنچاتی ہے تو اس تسکین یا حظ کے باوجود بھی اس کے پریشان ہونے کے امکانات ہوں گے۔ کیونکہ اس کے لیے جلق ایک مجبور کر دینے والی حرکت تھی ۔۔ ایک بچگانہ فعل اور مراجعت!

ان امور پر مبنی احساسِ پریشانی سے چھٹکارا پانے کے لیے اسے سب سے پہلے

تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ فعل کسی جسمانی نقصان کا باعث نہیں اور بے شمار عورتیں یہ سب کچھ کر چکی ہیں۔ گو جلق کے بعد محسوس کی جانے والی تکان یا چڑچڑاہٹ کو جنسی آسودگی کے اس طریقہ سے وابستہ کیا جاتا ہے حالانکہ یہ جلق سے پریشانی اور کڑھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسے ایک عام اصول کے طور پر سمجھ لیا جانے کہ کام یا جنسی کارکردگی اتنی تکان پیدا نہیں کرتی جتنی پریشانی تشویش یا فکر پیدا کرتے ہیں۔ پھر خود کو دوسروں سے علیحدہ اور انوکھا سمجھنے کا احساس گو یا جلتی پر تیل کا کام کرتا ہے

میرے خیال میں ادھیڑ عمر کی غیر شادی شدہ عورت کے لیے یہ نصیحت بہترین اور کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔

اگر وقتاً فوقتاً جنسی بے چینی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو کسی پریشانی یا احساسِ جرم کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم نارمل ہو اور ایک نارمل عورت کی تمام جسمانی خواہشات تم میں پائی جاتی ہیں اس لیے ان کے خلاف مستقلاً برسرِ پیکار رہتے ہر وقت زیادہ سے زیادہ پر تناؤ، آزردہ اور پریشان رہنے کی کوئی ضرورت نہیں اگر ہو سکے تو لمبے چوڑے تفکرات میں الجھے بغیر یہ بوجھ ہلکا کر دو۔ دوبارہ سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں اور جو کام ادھورا چھوڑا تھا اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ یہ گناہ نہیں! اس لیے کہ جنس شر نہیں۔ یہ فعل تو اتنا اہم بھی نہیں اسے تو تمہاری پریشانی اور تفکرات اہمیت دیتے ہیں۔

تمام عورتیں اسی "کاروباری" انداز سے اس مسئلہ سے نہیں نپٹ سکتیں۔ انہیں اس سے وابستہ مشکلات پر قابو پانے کے لیے انفرادی سطح پر نفسیاتی امداد کی ضرورت ہوگی اور اس مقصد کے لیے انہیں موزوں معالجین کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

یہ حقیقت واضح اور آشکار ہے کہ خودلذتی نارمل جنسی زندگی کے لیے یقیناً ایک ادنیٰ قسم کی نعم البدل ہوگی اور بعض عورتوں کے لیے تو اس کی غیر مطابقت، تنفر کا باعث ہوتی ہے۔ جنس ایک محبوب ہستی کے ساتھ شراکت کے لیے تخلیق کی گئی تھی۔ تاکہ بالآخر یہ انہیں والدین بنانے پر منتج ہو۔ جب کہ خلوتی خودلذتی اس مقصد کی موت ثابت ہوتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اسے مردود اور مضر قرار دیں — ہاں! کسی حد کے اندر رہنا شرط ہے!

دوستی — بطور ایک حل!

اگرچہ معاشقے کسی آسودگی بخش صورت تک پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ تاہم ایک اوسط درجہ کی عورت کی ہیجانی ساخت اس نوع کی ہوتی ہے کہ اس سے وہ کچھ نہ کچھ تبادل قسم کی آسودگیاں پالیتی ہے۔ ان میں وہ اپنی زندگی کی تشکیل نو کر سکتی ہے اور مکمل جنسی ناآسودگی کے باوجود بھی اسے زندگی میں آسودگی کا کوئی نہ کوئی پہلو مل جاتا ہے۔ دراصل جنسی جبلت ہر طور سے ارتفاع پذیری کی صلاحیت رکھتی ہے یہ عورتوں کے لیے اور بھی درست ہے اس نسائی محبت میں ہمدردی اور شفقت کو بہت دخل ہے اس کے لیے انہیں فطرت کا مشکور ہونا چاہیے اور چاہے جانے کی خواہش دوستی کی صورت میں بھی اظہار پا سکتی ہے۔

درحقیقت دوستی — ہمدردی اور محبت پر استوار دوستی — غیر شادی شدہ عورتوں کے لیے بہترین حل اور نعم البدل کی صورت رکھتی ہے۔ اس مقصد کے لیے ہم عمر عورتوں سے دوستی دیکھو نکہ اس عمر کی عورتوں کو ہم عمر مرد محض دوستی کے لیے کم ہی ملتے ہیں) کا ژرف نگاہی سے مطالعہ لازم ہو جاتا ہے۔ ایسی دوستی زیادہ تر ناپائیدار ثابت ہوتی ہے۔ یہ عورتیں صورتِ حال سمجھے بغیر اس دوستی کو اپنی تمام بچگانہ خواہشات و احساسات سے ملوکر لیتی ہیں یوں دوستی میں مطالبات، حسد و رقابت اور تشویش ان کی لاشعوری جنسی بزمردگی کی غماز بن جاتی ہیں۔

عنفوانِ شباب کے درجہ پر رک جانے والی معمر عورتوں کی دیگر عورتوں سے ذہنی دوستی ہیجانی لحاظ سے بے حد اہمیت اختیار کر جاتی ہے کیونکہ اس صورت میں زندگی کے اوّلیں اور ابتدائی دور میں اہم کردار ادا کرنے والے، دبائے گئے اور فراموش کردہ ان جذبات و احساسات، تمناؤں اور الجھنوں کو ایک طریق اظہار مل جاتا ہے جن کا مرکز اس کی اپنی ماں کی ذات تھی — یہی وہ لاشعوری اور غیر تسلیم شدہ محرکات ہوتے ہیں جن کی بنا پر ایسی عورتیں ایک دوستی کے بعد دوسری کے لیے خود کو تیار کر لیتی ہیں یا اپنی دوست عورت سے مکمل رابطہ کا دعوےٰ کرتی ہیں۔

ان بنیادوں پر استوار دوستیاں عموماً مشکلات کا موجب بنتی ہیں اس میں بچگانہ پن اور طفلیت کو بہت زیادہ دخل ہے۔ دوسرے کی ذات سے زائد از ضرورت توقعات کی وابستگی، بے پایاں حسد و رقابت، ہیجانی طوفان اور تعلقات کا مستقل خاتمہ — ایسی دوستیوں میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ ایسی دوستی میں اندھی پرستش اور پرجوش جذباتیت کا بھی مظاہرہ ملتا ہے۔ یہ اندھی پرستش اور پرجوش جذباتیت فرد کی بہترین صلاحیتوں کا نچوڑ ہوتی ہے اس لیے یہ دوستیاں اور ان کے بحران اس قابل ہیں کہ ان کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے۔ اگر ایسی دوستیوں کو تباہ کرنے والی ہیجانی ناپختگی کے پیدا کردہ عوامل کی اصلاح کر کے اپنی شخصیت سے جدا کیا جا سکے تو ایسی دوستی غالباً شادی اور گھر کے لیے ودیعت کردہ توانائی کے اخراج کے لیے ممکنہ اور بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔

جذباتی مسائل کا دوستی میں حل تلاش کرنے والی عورتیں صرف وہی نہیں جو اپنی نفسیاتی ساخت کی بنا پر لازماً دوسری عورتوں سے رشتۂ دوستی استوار کرتی ہیں بلکہ سبھی غیر شادی شدہ عورتوں میں دوسری عورتوں سے اپنے تعلقات کو محبت، ہمدردی اور شفقت پر استوار کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔

مخالف جنس کے دو افراد کی دوستی میں کسی نہ کسی مرحلہ پر جنس ضرور شامل ہو جاتی ہے لیکن دو عورتوں کے دوستانہ تعلقات کی جنس پر استواری لازم نہیں اس لیے ایسی دوستی وسیع مفہوم کی حامل ہوتے ہوئے، اشغال، دلچسپیوں اور خیالات و تصورات کی باہمی شرکت کا سودمند ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے ایسی دوستی کی کامیابی اور پائیداری کے لیے اپنی سہیلی کے وجود کو اس کی تمام ذاتی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ قبول کرنا لازمی شرط ہے اگر ایسا نہیں — یعنی سہیلی کو لاشعوری طور سے ماں، خاوند، بچہ یا ان تینوں کا ایک مجموعہ سمجھا جاتا ہو یا اس سے ان تمام توقعات کے پورا ہونے کا مطالبہ کیا جاتا ہو تو پھر بات نہ بن سکے گی۔ یہ بظاہر تو سیدھی سادی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں کیونکہ ان لاشعوری توقعات اور خیالی مفروضوں کی بنا پر ہی ایسی خامی دوستیاں تباہی اور پریشانی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔

ہم جنس پرستانہ دوستی

اس موقع پر ہم جنس پرستانہ دوستی کا جائزہ بھی ضروری ہے گذشتہ چند سالوں کی تحقیقات نے مردوں اور عورتوں میں ہم جنس پرستانہ دوستی کا کافی حد تک احساس کرا دیا ہے اگر اس موضوع کے بارے میں معقول معلومات ہوں تو یہ اچھی چیز ہے۔ ابتدا میں مردانہ ہم جنس پرستی کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن عورتوں کی صورت میں مادرانہ وابستگی اور مامتا کی جبلت کے باعث یہ مسئلہ مزید پیچیدگی اختیار کر جاتا ہے تاہم نفسی جنسی نشوونما میں رکاوٹ کی پیداکرد

ہم جنسیت اور خالص جنسی تقلیب میں اب امتیاز کرنا ناممکن نہیں رہا۔

عورتوں کی جس پر جوش دوستی کا ذکر کیا جا چکا ہے وہ بنیادی طور سے ہم جنسیت پر مبنی ہوتی ہے خواہ ایسی دوستی جنسیت سے پاک ہی کیوں نہ ہو۔ اگر ایسی دوستی نے دونوں عورتوں کے لیے کوئی سودمند صورت اختیار کرلی ہے تو بعض اوقات اس حقیقت کو تسلیم کر لینے ہی میں فائدہ رہتا ہے۔ حقیقت تسلیم کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ ساری دوستی ہی سرے سے مردود اور نامعقول قرار دے دی جائے۔ زندگی میں جنس ایک ناگزیر عنصر کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے دو افراد کی دوستی جب پر جوش ہو کر بے تکلفی کی حدود میں داخل ہوتی ہے۔ تو بعض مواقع پر جنسی احساسات کی بیداری کا امکان بھی ہو سکتا ہے اب یہ دوسری بات ہے کہ دونوں ہی کے ذہن ان احساسات کو تسلیم نہ کریں۔

لیکن جہاں یہ نا تعلیم شدہ ہو تو وہاں بوجھ اور تناؤ کی موجودگی لازمی ہے کیونکہ ایسی دوستی میں جبلی محرکات اور کم و بیش لاشعوری مجرمانہ احساسات ملتے ہیں۔ ایسے احساسات کے بارے میں اپنی ذات اور اپنی جبلی؟ مطابقت کے لیے اس امر کا احساس ضروری بن جاتا ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور ہمارا سابقہ کس سے ہے؟ اور یہ سب کچھ پیدا کرنے والے حالات کیسے ہیں؟؟ — چشم پوشی کے برعکس ان سے آگاہی فائدہ بخش ثابت ہوتی ہے س طرح ان تمام سلسلہ کو مردود اور ناپسندیدہ قرار دیتے ہوئے دوستی کا خاتمہ بھی نامناسب ہے دوستی کی جانچ کا معیار محبت ہے نہ کہ اس کے جسمانی مظاہر!

اپنی سہیلیوں کے لیے مردانہ میلانات رکھنے والی ایسی ہم جنس پرست عورت سے دوچار ہوتے ہیں جس کی جسمانی ساخت میں بھی مردانہ پن پایا جاتا ہو۔ ایسی دوستی میں کیونکہ جنس کو نقطہ اعتدال پر رکھنا مشکل ہو جاتا ہے اس لیے خود پر قابو پانے اور خواہشات کا گلا گھونٹنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے دراصل یہ دوسروں اور خصوصیت سے کم عمر عورتوں کے بارے میں ایک طرح کی ذمہ داری ہے ایک ناتجربہ کار اور انجان لڑکی کو غیر فطری جنسی تجربے سے متعارف کرانا بہت بڑی اور اہم ذمہ داری ہے کیونکہ ہو سکتا ہے اس سے اس کی نفسی جنسی نشوونما رک کر اسے شادی اور مادریت کے لیے نااہل بنا دے۔

یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ عموماً (عام اور مقبول عقیدہ کے برعکس) ایسی عورتوں میں جنسی جبلت اتنی قوی نہیں ہوتی بلکہ کام اور مختلف النوع کارگزاریوں کی صورت میں وہ جلد ہی ارتفاع پذیر ہو جاتی ہے ایسے مرد عموماً تخلیق اور فنونِ لطیفہ کا سہارا لیتے ہیں جب کہ عورتیں منتظمانہ صلاحیتوں اور میکانکی کاموں کی صورت میں اس کی تسکین کا سامان بہم پہنچا لیتی ہیں۔ اصولی طور سے ایسی عورتیں قوی اور انتظامی صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہیں اہم ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے سے کبھی نہیں ہچکچاتیں، مردوں اور عورتوں دونوں ہی کے ساتھ آسانی سے کام کر سکتی ہیں اور دوسری عورتوں کے ساتھ بآسانی دوستی پیدا کر لینے پر قادر ہوتی ہیں۔ مردوں کی مانند نفسی جسمانی ساخت کے اعتبار سے یہ نارمل نہیں ہوتیں اس لیے ان کی زندگی بھی کوئی ایسے آرام سے نہیں گزرتی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ مریض ہوتی ہیں یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ہر ابنارمل انسان خراب اور دیوانہ نہیں ہوتا (واضح رہے کہ نابالغہ بھی ابنارمل ہوتا ہے) ایسی عورتوں کا دنیا میں اپنا ایک مخصوص مقام ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت سے ان حالات میں بہت سودمند ثابت ہوتی ہیں جہاں عورتوں کو مردوں کا کام کرنا پڑے۔ اسی طرح دوستی کے نام پر یہ بھی بہت کچھ کر گزرتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ خالص جنسی جذبات کی قیمت کے نام پر عموماً ان پر محبت میں کومل اور قربانی کرنے والے عناصر کی نشوونما کا بوجھ بھی لاد دیا جاتا ہے۔

تغیرِ زیست (اختتامِ حیض)

اب ہم جنس سے بالواسطہ یا بالواستہ سوالات سے ہٹ کر غیر شادی شدہ کی نفسیاتی اور سماجی مطابقت سے واسطہ عمومی مسائل کا جائزہ لیں گے۔ غیر شادی شدہ عورتوں پر تغیرِ زیست کے اثرات کے بارے میں کچھ کہنا ضروری ہے۔

یہ سوچنا بالکل غلط ہے کہ شادی شدہ کے مقابلہ میں غیر شادی شدہ عورتیں اختتامِ حیض کے وقت زیادہ پریشان ہوتی ہیں۔ اکثریت تکلیف کے بغیر ہی اس دور سے گزر جاتی ہے ماہواری ختم ہو جاتی ہے اور انہیں بس اس کے ختم ہونے ہی کا احساس ہوتا ہے جب کہ بعض ایسی بھی ہیں جو اس دور کی جسمانی تکلیفوں اور دیگر علامات سے بہت پریشان ہو کر خاصی تکلیف اٹھاتی ہیں۔ جسمانی پہلوؤں سے قطع نظر نفسیاتی لحاظ سے بھی یہ وقوعہ بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں پر ہی اس کے اثرات جداگانہ نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اوّل الذکر کے لیے یہ طویل کارکردگی کی مدت کا اختتام ہے۔ بحیثیت بیوی اور ماں اس نے اپنے فرائض کی تکمیل کر دی اب اس کا جسم اسے یہ اطلاع دیتا ہے کہ اس کا کام مکمل ہو چکا ہے۔ موخر الذکر کے لیے بھی یہ اعلانِ اختتام ہی ہے لیکن ایک اور ہی انداز سے!

اب تک لاشعوری یا شعوری طور سے وہ خود کو ایک عورت سمجھ رہی تھی۔ ذہن کے کسی گوشہ میں یہ خیال ہمیشہ جاگزیں رہا تھا کہ شاید مجھے کوئی شوہر مل جائے اور میں بھی ایک بچہ حاصل کر لوں۔ لیکن اختتامِ حیض اس پر یہ واضح کر دیتا ہے کہ کم از کم بچہ کے ضمن میں اسے اپنے دل سے تمام امیدیں خارج کر دینی چاہئیں۔ بچہ پیدا کرنے اور اس کی تربیت کے لیے ودیعت کردہ صلاحیتوں کے اس زیاں پر ناامیدی اور پژمردگی کا اظہار بھی کیا جا سکتا ہے۔

— اور یوں ہم پھر جنس سے وابستہ بنیادی مسائل سے ہٹ کر غیر شادی شدہ کی زندگی سے مطابقت کے عمومی مسئلہ سے دوچار ہو جاتے ہیں — مشکلات سے بہرحالات میں سودمند ہوتے ہوئے خوش رہنے کے لیے عمل نوعیت کے سوالات؟

نفسیاتی مطابقت

وہ عورت جو نظریۂ حیات اور زندگی کے بارے میں اپنے طرزِ عمل کے لحاظ سے بالغ نظری کی حامل نہ ہو اور ہیجانی طور پر مطابقت کی صلاحیت نہ رکھتی ہو۔ ایسی عورت ایک پختہ طبع عورت کے مقابلہ میں زیادہ مشکلات محسوس کرے گی اس ضمن میں صرف حوالہ بالا عورتوں ایسی استثنائی مثالیں ملتی ہیں۔ جنہوں نے اپنی تمام ہیجانی اور جنسی توانائی کا رخ کسی کام، پیشہ یا سماجی بہبود کی طرف موڑ دیا ہو — اور اس میں کامیاب بھی رہی ہوں۔ اس کے برعکس پختہ طبع عورت کو اپنی زندگی میں شادی اور گھر کی عدم موجودگی کے پیدا کردہ خلا کا نسبتاً زیادہ احساس ہوتا ہے اور اس احساس سے مطابقت کوئی آسان کام نہیں۔ ہیجانی لحاظ سے ناپختہ عورت کی تمام مشکلات نجی تعلقات کی استواری سے وابستہ ہوتی ہیں جب کہ پختہ طبع عورت کی عدم ازدواج کی پیدا کردہ صورتِ حال سے!

اوّل الذکر عورتوں کی ذاتی مشکلات اور دوستی کے پیدا کردہ مسائل و الجھنوں سے نپٹنے کے لیے تحلیلِ نفسی یا ہیجانی نشوونما کے اعمال سے تعلق رکھنے والے دیگر علوم سے مدد لی جا سکتی ہے اور ان کے طرزِ عمل کی وضاحت کرتے ہوئے ان کی مشکلات کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ تحلیلِ نفسی کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام مشکل کی بنیاد ان کا طرزِ عمل یا کسی پریشانی کے وقت اختیار کردہ موقف ہوتا ہے وہ اس لیے

کہ اس کی اساس عہد طفلی کے انداز فکر پر استوار ہوتی ہے اور اسی لیے بالغانہ زندگی میں یہ بچگانہ طرز عمل پریشانیوں کا باعث بنتا ہے — دوسروں سے ناجائز توقعات کی وابستگی، انتظار کی صورت میں بچگانہ بے صبری کا مظاہرہ، حسد و رقابت کا طوفان، نوزاید کے بارے میں ننھی لڑکی والے ردِّ عمل کا اعادہ کیونکہ نوزاید کا وجود ماں کی نظروں میں اس کی وقعت کم کرنے کا باعث بن سکتا ہے، انحصاری عقیدت کی یک لخت معاندانہ رویہ میں تبدیلی، ماں اور بچہ کے پیچیدہ رشتہ کی تکرار — یہ تمام عوامل ہی دوستیوں یا ہم پیشہ عورتوں کے تعلقات میں ہیجانی بحرانوں کی تہ میں ظہور پذیر ہوتے ہیں جو عدم تحفظ کے احساس یا محبت نہ کیے جانے (بچہ کی صورت میں ناپسندیدگی) کے خوف کے غماز ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ پریشانی کے ان بچگانہ ماخذات کو تسلیم کرکے ان پر مبنی طرز عمل مسترد کر دیا جائے۔ یہ عزم صمیم ہو اور پھر اس کے لیے جو قیمت بھی ادا کرنی پڑے اس سے گریز نہ کیا جائے۔ وہ عورت جو محبت کی زندگی میں ماں بچہ کے تعلق والی سطح سے آگے نہیں بڑھ سکی یہ محسوس کرے گی کہ محبت کی طلب سے دست برداری اس کے لیے ترک محبت کے مترادف ہے۔ لیکن یہ احساس بھی بچگانہ ہے: کیونکہ محبت متوقع اور دعاوی کی پابند نہیں اور صرف ایک بچہ ہی یوں سوچ سکتا ہے۔

اوائل طفلی کی ہیجانی الجھنوں سے وابستگی کا ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بالغ عورت غیر متمدن فوق الانا — جس کی تشریح مضمون کی ابتدا میں کی جا چکی ہے — کے چکر سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ اس طفلانہ توانائی کے تقاضوں کی بجا آوری کے لیے ایسی عورتیں اپنی نارمل جبلی قوتوں کو اس حد تک دباتی ہیں اور ان کے معمول سے اظہار پر بھی اتنا لمبا چوڑا دفاع کرتی ہیں کہ زندگی امتناعات سے عبارت ہو جاتی ہے بلکہ بعض اوقات تو ان میں زندگی بسر کرنے اور کام کرنے کے لیے عمومی قوتِ حیات بھی باقی نہیں رہتی۔ زندگی سے خوفزدہ یہ عورتیں زندگی کی خوشیوں کے مقابلہ میں کمتر قسم کا منفی طرزِ عمل اپنا لیتی ہیں۔ حالانکہ غیر شادی شدہ عورتوں — اور مردوں — کے لیے یہ امر بہت زیادہ اہم ہے کہ زندگی دلچسپیوں، آسودگیوں اور مواقع کی صورت میں جو کچھ بھی پیش کرے اسے قبول کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ شادی شدہ عورت کے پاس اتنا فالتو وقت یا توانائی نہیں ہوتی کہ وہ کسی طرح کی دلچسپیوں یا اشغال سے دل بہلا سکے۔ لیکن غیر شادی شدہ عورت کے لیے تو یہ لازمی ہیں۔ بلکہ ملازمت سے سبکدوشی سے قبل موزوں وقت پر ایسی دلچسپیوں اور مشغلوں کی طرف رجوع کر لینا چاہیئے کیونکہ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد وقت کٹی کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہتا ویسے تو یہ تمام غیر شادی شدہ افراد پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ لیکن تشویش اور امتناعات میں جکڑی عورت کو زندگی میں مثبت نقطۂ نظر اور طرز عمل کی اہمیت کا احساس کرا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایسی عورتیں عموماً تشویش کی بنا پر ایسا کوئی کام کرنے کی خواہاں نہیں ہوتیں جسے دوسرے (زیادہ خود) ناپسند قرار دیں اس لیے وہ زندگی میں ملنے والے مواقع کے بارے میں نابینا ہی رہتی ہیں نہ ہی وہ ان امکانی مواقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہیں جو بعض اوقات دامنِ زیست مسرت کی کلیوں سے بھر دیتے ہیں۔

بعض اوقات مجرد عورت کو بچہ اپنانے کا مشورہ دیا جاتا ہے کہ اس سے اس کی تمام مشکلات ختم ہو جائیں گی۔ یہ درست ہے کہ یوں مادرانہ جبلت — جو ہر عورت میں قوی تر ہوتی ہے — کی تسکین ہو جاتی ہے۔ یہی مادرانہ جبلت وقتی بڑی پریشانیوں کا باعث بنتی ہے۔ اس ضمن میں مالی ذمہ داریاں سے قطع نظر — جن سے اکثر پیشہ ور عورتیں عہدہ برآ نہیں ہو سکتیں، خود بچہ کا بھی علیحدہ مسئلہ ہے۔ ایک بچہ کی نفسیاتی نشوونما کے لیے — جس نے ابھی تمام زندگی گزارنی ہے — اس سے زیادہ تباہ کن بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ ایک ایسی ادھیڑ عمر عورت کے قبضہ میں ہو جو تمام عمر محبت کی بھوکی رہی اور جواب پژمردگی کی شکار ہے۔ عورتوں کے لیے اپنی محبتوں کے تناؤ سے چھٹکارے کی خاطر کسی بچہ پر قبضہ جمانے کی بجائے ایک دوسرے کی ذات کو وسیلہ بنانا کم خطرناک بات ہوگی۔ اس سے ان کی مادرانہ جبلت قدرے تکلیف دہ ہی سہی مگر کم نقصان دہ صورتوں یعنی کام اور شاگردوں، ماتحتوں، مریضوں، دوستوں اور ہم پیشہ افراد سے رابطہ میں تسکین پا سکتی ہے۔ اس لیے محض ذاتی مفاد کی خاطر کسی بچہ کی قسمت کا فیصلہ کر دینے سے پہلے دیگر عوامل پر بھی نگاہ ڈال لینی چاہیئے۔

عملی نقطۂ نگاہ سے مجرد عورتوں کا مل جل کر ایک گھر بنا کر رہنے میں فائدہ ہے یوں ذہن میں "گھر" کا تصور بھی آجاتا ہے۔ ویسے ہر عورت ہی گھر بار کی متمنی ہوتی ہے۔ بعض تنہائی پسند عورتوں کی استثنائی مثالیں بھی ملیں گی لیکن تنہائی بہت سے مسائل اور مشکلات کا باعث بنتی ہے مثلاً کھانا پینا یا بیماری میں تیمارداری وغیرہ۔ یہ خود کفیلی انہیں اپنی ذات کے دائرہ میں مقید کر کے ان میں دوسروں سے ہمدردی اور دلچسپیوں کو محدود کر دیتی ہے۔ اس سے ان میں جو سخت گیری اور دوسروں کی دخل اندازی کی شدید ناپسندیدگی پیدا ہو جاتی ہے وہ دوستی کے لیے مضر رساں ثابت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ایک مشترک گھر بعض دقتوں یا جھلاہٹوں کے باوجود بھی فطری حیثیت رکھتا ہے۔ اور کھانا پکانا اور بیماری وغیرہ کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے اس صورت میں گو کچھ ذمہ داریاں اور بعض اوقات خاصے تکلیف دہ جھمیلے بھی پالنے پڑتے ہیں لیکن آنے والے سالوں میں جب عورت رشتہ داری کے تمام بندھنوں سے آزاد ہو کر پہاڑ سی زندگی تن تنہا بسر کرتی ہے۔ تو اس وقت کے لحاظ سے یہ ذمہ داریاں اور جھمیلے کچھ بھی نہیں ہیں۔

درحقیقت تو بڑھاپے سے مجرد عورت کی زندگی میں سختیوں کا دور آتا ہے۔ ایسے میں خود کو سنبھالے رکھنے کے لیے عورت کو اپنی تمام ہمت اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب حالات کے باعث زندگی میں خوشی اور مسرت بخشنے کے لحاظ سے ان کا وجود ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ غیر شادی شدہ عورت کے ساتھ ہی ایسا نہیں ہوتا بلکہ اکثر بوڑھوں کو بھی اس تلخ حقیقت سے آگاہ ہونا پڑتا ہے۔ خاندانی بندھن کچھ نہ کچھ وقعت ضرور رکھتے ہیں اور کسی ایسے بندھن کے بغیر یا کسی دور کے بندھن کی موجودگی میں زندگی تنہائی کی مہر لگ جاتی ہے یوں خودترسی سے بچنے کے لیے اپنے تمام عزائم اور ہمت کی ضرورت ہوگی خودترسی بہت خطرناک ہے اور زندگی سے برگشتگی کے لیے صرف یہی کافی ہے اس لیے ایسا وقت آنے سے پہلے ہی اپنے لیے اشغال و دلچسپیوں کو تیار رکھنا چاہیئے تاکہ تنہا بڑھاپے میں وہ خود کو بالکل ہی ناکارہ نہ سمجھ بیٹھے یہاں ہر مرد اور عورت کے لیے جگہ بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ دوسروں سے ناجائز ہیجانی توقعات نہ وابستہ کر بیٹھے۔ یہ درست ہے کہ بیماری وغیرہ کی صورت میں بعض جسمانی مطالبات کیے جاتے ہیں لیکن ایسے مطالبات پورے کرنے والے انہیں ناپسندیدہ نہیں سمجھتے اس صورت میں بھی بیماری کے پیدا کردہ جسمانی مطالبات کا ہیجانی رنگ خودترسی سے مملو ہونا اچھا نہیں۔ بوڑھا ہونے کے بعد یک لخت بڑھاپے کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں اس لیے یہ وقت آنے سے پہلے ہی اپنے لیے دلچسپیوں اور اشغال کی تلاش سودمند رہے گی — ان سب سے زیادہ بہتر اور مفید چیز زندگی کے بارے میں ایک فلسفۂ حیات ہے ایسا فلسفہ جو ذاتی اور محدود تجربات سے ماورا ہو کر زیادہ وسیع اور بلند نظریات پر استوار ہو — ہم میں سے ہر ایک نے زندگی میں کسی نہ کسی وقت ایسے بوڑھے دیکھے ہونگے جن کے بارے میں کوئی بھی یہ نہیں سوچتا کہ آیا ان کی شادی ہوئی تھی یا وہ تمام عمر مجرد رہے ہاں ان کی شخصیت سے خوداعتمادی شعاعوں کی مانند پھوٹتی ہے۔ انہیں زندگی سے دلچسپی ہے اور یہ اس سے حظ اٹھاتے ہیں یہ حالات کے محکوم نہیں بلکہ حالات پر حاوی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے لیے کسی کو بھی افسردہ ہونے یا ان پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں کیونکہ انہیں ان کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم میں سے جو شادی نہ کریں گے انہیں بھی ایسے لوگوں ایسا بننے کے لیے خاصی محنت اور ضبطِ خود کی ضرورت ہوگی۔ لیکن ان کا وجود اس امر پر دال ہے کہ یہ ناممکن نہیں!

ترکِ دنیا اور جنسی عوامل

—— ० ——

نفسیات میں جدید رجحانات کی بنا پر مذہب اور جنسی جبلت کے باہمی تعلق کا مسئلہ نمایاں حیثیت اختیار کر چکا ہے یہ مسئلہ مشکل ہی نہیں نازک بھی ہے اس لیے جب ہم نفسیات مذہب کا علمی نقطۂ نظر سے جائزہ لینے کی سعی کرتے ہیں تو تامل اور ہچکچاہٹ کو دوگنی قوت سے محسوس کیا جاتا ہے۔ دراصل ہم کوئی نیا مسئلہ نہیں پیدا کر رہے بلکہ ہم تو ان مسائل کا جائزہ لے رہے ہیں جو عوام کی کثیر تعداد پیدا کر چکی ہے بلکہ یہ تو مذہب کی بہبود کے لیے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ ان مسائل کا تجزیہ مذہب کے دشمنوں کی بجائے ایسے افراد کے ہاتھوں ہونا زیادہ سودمند ثابت ہو سکتا ہے جو اس کے بارے میں ہمدردانہ انداز نظر رکھتے ہوں۔ مذہب اور جنس کے ایک بڑے مبلغ تھیوڈور شروڈر کے نظریہ کو مختصراً دو نکات میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے (۱) تمام مذہب جنسی احساسات کی خام تعبیر کی حیثیت رکھتا ہے (۲) اسی لیے مذہب بے سود اور افادے سے خالی ہے۔

پہلے نکتہ کے بارے میں اس کی وضاحت یوں ہے۔ "آغاز میں تمام مذاہب ہی جنسی سرخوشی کی خام تعبیر کی حیثیت رکھتے ہیں اور آج کا مذہب بھی اسی نفسی اور جنسی کجروی کی اتفاقی صورت ہونے کی بنا پر غیر تبدیل شدہ ہے۔ اس لیے ہم۔ خدا محبت ہے۔ کو اس کے لفظی معنی میں قبول کر سکتے ہیں۔ یہ محبت روحانی نہیں بلکہ جنسی محبت ہے۔ بعض اوقات یہ مجاز کے پردوں میں ظاہر ہوتی ہے اور اسے وہ محبوب آسانی سے شناخت نہیں کر سکتا جو اپنی مریضانہ محبت کی تمناؤں کے اظہار کے لیے کسی انسانی محبوب کی بجائے ایک خدا کی تخلیق کر لیتا ہے"۔ میں یہاں اس کا تجزیہ نہ کروں گا۔ کیونکہ مسٹر شروڈر کے اس نظریہ کے حق میں دلائل کی کمزوری اور سطحیت واضح ہے، لیکن ایک نکتہ اب بھی توجہ کا طالب ہے اس نظریہ کے حامیوں کی تحریروں کے جائزہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مذہب کی تعریف اس انداز سے کرتے ہیں اور ان میں ایسے عناصر کی شمولیت پر زور دیتے ہیں۔ جنہیں بعد ازاں اپنے حق میں برتا جا سکے چنانچہ مسٹر شروڈر کا حامی مذہب کی تعریف یوں کرتا ہے۔ "مذہب ایک معروضی تجربہ ہے جو بلحاظ نوعیت سرخوشی کا باعث ہوتا ہے جس کی وجہ نام نہاد "انفاعیت" قرار دی جاتی ہے اس کی تشریح ان ذہبی عقائد اور رسومات کی صورت میں کی جاتی ہے جن کے ذریعہ سے نہ صرف ان کا جواز ہی پیدا ہوتا ہے بلکہ انسانوں کے بعض ذاتی مقاصد کی بجا آوری بھی کرتی ہیں ان میں سے موخر الذکر کو کلی یا جزوی طور سے "مافوق الطبعی" حیثیت کا تسلیم کیا جاتا ہے"۔

مذہب کو محض معروضی تجربہ تک ہی محدود کر دینے سے یہ مسئلہ بڑی آسانی مگر غیر مناسب طریقہ سے سلجھ جاتا ہے۔ میں مسٹر شروڈر کے پیش کردہ حقائق کو جھٹلاتا نہیں بلکہ میں تو ان پر زور دیتا ہوں بلکہ میں تو اس حد تک ان کا قائل ہوں کہ نفسیات مذہب کا کوئی ایسا نظریہ جو ان حقائق سے چشم پوشی پر استوار ہو۔ درخورِ اعتنا ہی نہیں ہے۔ لیکن اس ضمن میں یہ ثابت نہیں کیا جا سکا کہ مذہب صرف ان ہی عناصر سے عبارت ہے۔ حالانکہ اس سلسلہ میں اسی کو ثابت کرنے کی ہی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

مذہبی اقدار اور جنسی جبلت کے باہمی رابطہ پر ہر نوع کی بحث کے آغاز سے پہلے اپنے ذہن سے اس تعصب کو پاک کرنا لازم ہے جس کی بنا پر ایسے مسائل پر درست فیصلہ کا امکان نہیں رہتا۔ یہ تعصب ہمارے وہ احساسات ہیں جو ہم میں ایک لحاظ سے موروثی طور پر جڑ پکڑ چکے ہیں اور جن کی بنا پر ہم جنس کو گندگی اور گھناؤنی شے سمجھتے ہوئے اس میں اور مذہب میں کسی قسم کے تعلق کا ذکر تک بھی گوارا نہیں کر سکتے حالانکہ جہاں تک اس جبلت کا تعلق ہے تو اخلاقی لحاظ سے نہ اس میں خیر ہے اور نہ ہی شر۔ جنس سے وابستہ اخلاقی اقدار تو اس وقت جنم لیتی ہیں جب ہم اپنے اعلیٰ ذہنی وظائف کی بنا پر جنسی تقاضوں کے منہ زور گھوڑوں کو لگام دیتے ہیں۔ خواہ ہم انسانی کردار کے ان ارفع ترین پہلوؤں کو لیں جنہیں ہم محبت پر استوار قرار دے سکتے ہیں یا انسانی کردار کی اتھاہ پستیوں کو لیں جنہیں "شہوانیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہر دو صورتوں میں ان کی تہ میں جنسی جبلت کارفرما نظر آئے گی۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ ایک طرف تو ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ گردہی جبلت اور پدرانہ جبلت مذہب سے وابستہ کردار کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں لیکن جب اس ضمن میں جنس کا نام لیا جائے تو سب پر دہشت غلبہ پا لیتی ہے۔ مجھے اس کی اب تک سمجھ نہ آ سکی۔ بہر حال اس ذہنی تعصب سے چھٹکارا حاصل کرنا لازم ہے یہ صرف اس تعصب کی بنا پر ہے کہ بعض لوگ مذہب پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اس کے حسن و قبح سے بحث کرتے ہیں تو ان کی تنقید میں زہرناکی کا عنصر آ جاتا ہے مثلاً سی۔ کوہن کی "RELIGION AND SEX" میں اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہ مذہب اور جنس میں جتنے بھی روابط ہو سکتے تھے ان کی فہرست مرتب کر دی گئی ہے گو اس نے کوئی نیا نظریہ نہیں پیش کیا۔ لیکن وہ اپنی جگہ اس امر سے مطمئن ہے کہ اس قسم کے روابط کا بیان ہی مذہب پر چوٹ سے کم نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مذہبی جذبات کا جنسی جبلت سے کسی قسم کا بھی تعلق نہیں؟ لیکن اس سے تو عام مشاہدات پر مبنی حقائق کی تکذیب ہوتی ہے اگر شواہد سے جنس و محبت میں کسی قسم کا تعلق ثابت ہوتا ہے تو ہمیں اس رابطے کو دریافت کرنا چاہیئے اور مذہب کے لیے اس کی اہمیت کی حدود مقرر کرنی چاہئیں۔

سب سے پہلے تو ہمیں اس امر کا جائزہ لینا چاہیئے کہ وہ کون سے ایسے شواہد ہیں جن کے تجزیہ سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ مذہبی جذبات کسی مخصوص جبلت پر استوار ہیں اس ضمن میں ہمیں کئی طرح کے شواہد مل سکتے ہیں۔ اوّل ــ ہمیں یہ حقیقت ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اگر ایک جبلت تمام انسانی زندگی کے دوران فرد کے افعال و حرکات سے ہم آہنگ نہیں رہتی ہے بلکہ اس کی نشوونما، ارتقاء اور انحطاط بعض مخصوص ادوار سے عبارت ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر مذہب اسی جبلت پر استوار ہے تو اس میں بھی ایسے ہی تغیرات اور تبدیلیوں کے مظاہر ملنے چاہئیں۔ دوئم۔ اگر مذہب کسی جبلت پر استوار ہے تو ہمیں یہ توقع رکھنی چاہیئے کہ مذہبی جذبات بھی اپنے اظہار کے لیے اسی پیرایہ کا چناؤ کریں گے جو اس جبلت کے اظہار کے لیے مخصوص ہو چکا ہے۔ سوئم۔ جبلت سے وابستہ عام کردار کے بعض پہلوؤں کو دبانے کے لیے جو طریق کار اپنایا جاتا ہے مذہبی عوامل کو بھی ان پر منطبق ہونا چاہیئے۔ چہارم۔ وہ مذہب جو عدم ضبط کی وجہ سے ہیجانی لحاظ سے زیادہ شدت اختیار کر لیتا ہے تو اسی صورت میں اسے جبلت کی تسکین کے لیے بھی تمام پابندیوں اور ضوابط کا لحاظ رکھے بغیر کارکردگی کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔

جب ہم ان معیاروں پر جنس اور مذہب کے باہمی رابطے کا جائزہ لیتے ہیں تو ان سے مثبت نتائج کا ظہور ہوتا ہے مذہب سے وابستہ بعض مخصوص قسم کے اشغال اور مذہبی نشوونما کے بعض خاص پہلو جنسی بحرانوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مذہبی ہیجانات اپنے اظہار کے لیے (خصوصیت سے صوفیوں کی صورت میں) عموماً انسانی محبت کی زبان اختیار کرتے ہیں۔ مجموعی لحاظ سے مذہب نے عصمت کو بہت زیادہ اہمیت دے رکھی ہے پھر بعض مذہبی اشغال میں یہ رجحان بھی پایا جاتا ہے کہ وہ جنسی آزادی کی صورت میں اختیار کر لیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی جب ہم ان حقائق کا ژرف نگاہی سے تجزیہ کرتے ہیں تو اس سے یہ کہیں بھی نہیں واضح ہوتا کہ مذہب محض جنسی جبلت کی ارتقاپذیری کا نام ہے بلکہ برعکس اس کے تمام شواہد اس کے الٹ اشارہ کرتے ہیں۔ جب ہم ان چاروں حقائق کا باری باری جداگانہ طور سے جائزہ

جائے۔ تو ہم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی اور ان شواہد سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ ان دونوں میں باہمی روابط ملتے ہیں۔

سب سے پہلے تو ہم فرد میں مذہب اور جنس کی نشو و نما کا جائزہ لیں گے اس ضمن میں نمایاں ترین مثالیں ان لوگوں کی ہیں جو عنفوانِ شباب میں ترکِ دنیا کا ارادہ کر لیتے ہیں یہ خصوصیت سے اس معاشرہ میں زیادہ ہیں جہاں ترکِ دنیا کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ سٹاربک نے اس مسئلہ پر خصوصیت سے غور کیا ہے اور اس کے اخذ کردہ نتائج PSYCHOLOGY OF RELIGION میں طبع ہوئے ہیں اس نے اپنے نتائج کو یوں بیان کیا ہے "ترکِ دنیا کا اداور خلقی طور پر عنفوانِ شباب کا وقوعہ ہے۔ نمایاں ترین بات یہ ہے کہ اس کے لیے عمر کے مخصوص ادوار اور سالوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے ان کا آغاز سات یا آٹھ سال کی عمر سے ہوتا ہے پھر دسویں اور گیارھویں سال میں کنورشن کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اس کے بعد سولھویں میں زیادہ تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ بیسویں سال میں اس میں کافی تقلیل ہو جاتی ہے اس کے بعد اس میں کمی ہی ہوتی ہے اور تیس سال تک تو شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے۔ یہ عام طور سے مردوں کی نسبت عورتوں میں نسبتاً زیادہ اوائل عمری یعنی تیرہ سے سولھویں سال میں پایا جاتا ہے جب کہ مردوں میں زیادہ تر سترھویں سال میں یا اس کے فوری بعد یا پیشتر اس کا ظہور ہوتا ہے ترکِ دنیا اور عنفوانِ شباب کا چولی دامن کا ساتھ سمجھئے۔ ویسے بھی یہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں"

عنفوانِ شباب کے اس دور میں نئے نئے ترکِ دنیا کرنے والوں میں اہم تبدیلی ہیجانی قناعت میں اضافہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اسی سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس میں اس کی تعلیمات کو اتنا دخل نہیں ہوتا جتنا اس میں اس کے اپنے تجربات کا ہاتھ ہوتا ہے یعنی یہ دو بھی کم اور کبھی زیادہ ہوتے ہیں اس لیے مذہب میں روایتی عنصر کم ہوتا جاتا ہے جب کہ تجرباتی عنصر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ سٹاربک نے تو یہ بھی واضح کیا ہے کہ عمر کے اس دور میں اس قسم کی تبدیلی ان افراد کے مذہبی ارتقاء کے ضمن میں بھی ظاہر ہوتی ہے جو ترکِ دنیا نہیں کرتے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مذہب کے تجرباتی عناصر کی تشکیل میں جنسی جبلت کا بھی ایک حد تک ہاتھ ہے لیکن اگر ہم اسے ہر چیز پر ہی منطبق کرنا شروع کر دیں تو اس کے لیے ہمارے پاس ناکافی شواہد ہیں: بچپن میں مذہب سے ہیجانی وابستگی قطعی طور سے مفقود نہیں ہوتی ہے اور بعض اوقات تو۔ گو ایسا خال خال ہی ہوتا ہے۔ عنفوانِ شباب سے پہلے ہی شدید قسم کے ہیجانی تجربات سے روشناس ہو جاتی ہے جب بڑھاپے میں جنسی زندگی ختم ہو جاتی ہے تو اس وقت ہمیں مذہب سے ہیجانی وابستگی میں اس سے ملتی جلتی کمی نہیں ملتی ہے۔

آیئے اس مسئلہ کے دوسرے پہلو کا جائزہ لیں۔ یعنی مذہبی ہیجان کا جب وہ رجحان جنس کے زیرِ اثر اپنے اظہار کے لیے انسانی محبت کا سہارا لیتا ہے۔ یہ رویّہ صوفیوں میں بہت عام ہے۔ چنانچہ سینٹ جان آف کراس نے "THE DARK NIGHT OF THE SOUL" میں صوفیانہ اتصال کا یوں اظہار کیا ہے۔ یہ بالکل انسانی محبت کے اظہار کا انداز ہے گو اظہارِ الفت کے عام طریقوں میں بھی ایسی ہی زبان استعمال کی جاتی ہے لیکن صوفی عموماً ایسے اندازِ بیان کو نہیں اپناتے ہیں۔ چنانچہ بعض مذہبی گیتوں اور بھجنوں میں یہی رجحان کارفرما ملتا ہے۔ گو ایک نظریہ کی رو سے انسانی محبت اور مذہب کی تطبیق پر بے حد زور دیا جاتا ہے مگر اس کے باوجود بھی صوفیوں میں اظہار کے لیے ایسا انداز عالمگیر طور سے کبھی بھی نہ اپنایا گیا جب ایک صوفی اپنے وجد کے احساسات کی ترسیل کے لیے عام زبان کو ناکافی تصور کرتا ہے تو وہ رمز و ایماء کا سہارا لیتے ہوئے ایسا علاماتی اور استعاراتی اسلوب اپناتا ہے جس نے زندگی کے ہر پہلو سے رنگ لیا ہوتا ہے چنانچہ وہ آسمانی محبوب اور منگنی کا ذکر کرتا ہے۔ وہ روحانی شادی کی بات کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان اشارات کو بھی بروئے کار لاتا ہے جو سماعت، لمس اور ذائقہ کی حیات سے وابستہ ہیں۔

سوم: مذہب نے عصمت کے تصور کو ایک اعلیٰ اور ارفع مقام دے رکھا ہے بالفاظِ دیگر مذہب جنسی جبلت کے کلی دباؤ کا حامی ہے۔ صوفیوں میں بھی اسے بہت اہمیت حاصل ہے مسیحیت میں تو مدتوں تک شادی کو محض اس لیے جائز نہ سمجھا جاتا تھا کہ اس میں بذاتِ خود کسی قسم کا خیر یا شر ہے بلکہ اسے وہ انسانی کمزوریوں کے لیے ایک قسم کی "رعایت" تصور کرتے تھے اس رجحان کو مبالغہ کی انتہا تک لے جانا آسان ہے جیسا کہ فیوربابچ نے کیا تھا اس کے بقول "مکمل مسیحیت کی رو سے شادی ایک گناہ ہے اور یہ ایک قسم کی کمزوری ہے جس کی اجازت دی گئی ہے اور جسے معاف کیا جاتا ہے" لیکن اب بھی یک زوجگی کی شرط رہ جاتی ہے لیکن صوفیوں نے عصمت کو جو اعلیٰ معانی پہنائے وہ صاف اور واضح ہیں۔ ان کے بموجب رہبانیت سے محظوظ ہونے کے لیے مکمل عصمت انسانی محبت کی تسکین سے کلی احتراز لازم ہے۔ لیکن ایک بات ہے کہ اس ضمن میں ہمیں جنسی جبلت تنہا نہیں نظر آتی ہے اور صوفیوں کے نزدیک تمام جبلتوں کو دبانا مذہباً اشد ضروری ہے چنانچہ مذہبی زندگی میں اعلیٰ اور بلند مدارج طے کرنے کے لیے عاجزی، فاقہ کشی اور تنہائی کے ساتھ ساتھ عصمت بھی لوازم میں سے ہے۔ عاجزی خود نمائی پر غلبہ کا نام ہے اور محرکِ اعلیٰ تحفظِ ذات کی جبلت بنتی ہے۔ فاقہ کشی جبلتِ تغذیہ کو کند کرنا ہے اسی طرح تنہائی پسندی ان جبلی تقاضوں کی عدم تسکین ہے جن کے زیرِ اثر باہمی انسانی روابط جنم لیتے ہیں لہٰذا صوفی کے لیے جنس کے ساتھ ساتھ ہر نوع کی خواہشات سے اجتناب لازم ہے۔

چہارم۔ ہمیں اس رجحان پر بھی نگاہ ڈالنی چاہیئے جو نشو و نما پا کر بعض اوقات جنسی آزادی کی صورت میں رونما ہوتا ہے اگر مذہبی جذبے کے ارتقاء میں جنسی جبلت کی فطری نشو و نما سے وابستہ تقاضوں کی آسودگی کو دبانے کا بھی ہاتھ ہو اور اگر ایسے واقعات بھی ہمارے مشاہدے میں آ جائیں جن میں یہ دبائی گئی خواہشات ایک شدید قسم کے جنسی ابال کا انداز اختیار کر لیں تو یہ تعجب خیز نہ ہونا چاہیئے۔ خوش قسمتی سے ایسے واقعات کی تعداد کم ہوتی ہے یہ ایسے افراد کی بات ہے جنہوں نے کسی نہ کسی وجہ سے مذہب اور جنسی فعل کو مشروط کر لیا ہے۔ ایسے لوگ ہر عہد میں پائے جاتے ہیں اور مسیحیت کے ابتدائی دور سے لے کر آج کے ترقی یافتہ روس اور امریکہ میں بھی یہ عنقا نہیں ہیں۔ ان میں سے اکثریت کا آغاز عصمت کو ارفع ترین مقام اور ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے سے ہوا۔ اور مسٹر کوہن کی "RELIGION AND SEX" میں تحقیقات کے بموجب تمام شواہد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کی جبلی اساس کی تشکیل میں جنسی جبلت کا بھی حصّہ ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تمام مذہب ہی اس پر استوار ہے۔ یہ جبلت عنفوانِ شباب کے شدید مذہبی ہیجانات اور متصوفانہ جذبات کی تشکیل میں جو اہم کردار ادا کرتی ہے اسے ارتفاع کی مثال قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ ایک جبلت کا ایسا دباؤ نہیں جس کے نتائج کی صورت میں اس کی توانائی کو مذہبی مقاصد کی بجا آوری کے لیے بروئے کار لایا جاتا ہو۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مذہبی جذبات کا ایک حصّہ اسی اندرونی ساخت کا مرہونِ منت ہے جسے ہم جنسی جبلت کا نام دیتے ہیں یہ بالکل انسانی محبت کی مانند ہے گرنش ذاتی طور پر اسے قطعی طور سے تسلیم نہیں کرتا کہ یوں مذہب کی توقیر ہوتی ہے۔ کیونکہ اکثر صوفیائے کرام نے یہ حقیقت تسلیم کی ہے کہ ان کی وہ خواہشات جو تسکین کے لیے انسانی محبت کی محتاج تھیں انہوں نے بالآخر اسے خدا کی محبت میں سمو دیا اور بقول کونٹری پٹمور "انسانی محبت ہی ربانی محبت سے متعارف کرا کے اس محبت کی تفسیر بنتی ہے" اس طرح جب ڈاکٹر جی سٹانلے ہل نے ان خیالات کا اظہار کیا تو اس کا مقصد مذہب کی توہین نہ تھا "انسانی محبت کو ارتفاعیت کے درجے پر لایا جائے تو وہ آسمانی محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اور جب عاشق منزہ ہو کر تکمیل پاتا ہے تو وہ صوفی کا درجہ اختیار کر جاتا ہے"۔

انسانی اور آسمانی محبت کے مابین تعلق کی وضاحت کے لیے آخری مثال کے طور پر ایک مسلمان شاعر جامی کو پیش کیا جاتا ہے جس نے اپنی مثنوی "یوسف زلیخا" میں انسانی محبت کی اس لیے توصیف کی کہ اس سے انسانی روح آسمانی محبت کی بلندیوں اور رفعتوں سے روشناس ہوتی ہے اس کے بموجب جب تک انسانی محبت کا تجربہ حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک آسمانی محبت سے لذت آشنائی ممکن نہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے یہ تنبیہہ بھی کی ہے (اور یہ تنبیہہ ان تمام مذاہب کا خاصہ ہے جن میں متصوفانہ رجحانات شدت سے کار فرما ہوتے ہیں) کہ روح کا دارومدار صرف انسانی محبت ہی پر نہ ہونا چاہیئے بلکہ اس کی اہمیت صرف اسی لیے ہے کہ ارتفاع کے ذریعہ سے مذہبی مقاصد کے لیے اسے کام میں لایا جا سکے۔

تحلیلِ نفسی کے نظریہ کے بموجب بچپن میں انسان میں اپنے والدین پر انحصار کا جو رجحان پایا جاتا ہے وہ نشوونما پانے کے بعد جب انسانی محبت میں اپنی آسودگی کے لیے ناکام رہتا ہے تو اس کا اظہار مذہب کی صورت میں ہوتا ہے لیکن یہ محل نظر ہے جہاں تک تو اسے مذہب میں ایک عنصر کی حیثیت دینے کا تعلق ہے تو اس میں تو کسی قسم کا شک نہیں لیکن تمام مذاہب کا انحصار ہی اس پر قرار دیا ہو تو اس کیلئے ہمارے پاس شواہد نہیں ہیں۔ بچپن کے اطوار کا اظہار تو بعض مسیحی بھجنوں اور بعض صوفیوں کی تحریروں سے ہو جاتا ہے۔ بچپن میں والدین پر انحصار کی مثال اس بھجن میں مل جاتی ہے جس کا آغاز یوں ہے۔

"یسوع کے بازؤں میں محفوظ"

اور "میں اپنی روح کو یسوع پر آرام دیتا ہوں"

یا پھر جیسے لیڈی جولین کے اس اقتباس سے بھی اس کا اظہار ہو جاتا ہے "ہماری روحانی آنکھوں کے لیے آسمانی ماں حسین اور خوبرو ہے اور آسمانی ماں کی آنکھوں میں مقدس بچے قیمتی اور خوبصورت ہیں اور میرے نزدیک زندگی کے تمام ادوار میں سے بچپن کا دور سب سے زیادہ اعلیٰ ہے جب کہ ہم قوتِ ارادی اور سمجھ بوجھ کے لحاظ سے کمزور اور ناپختہ ہوتے ہیں کیونکہ ہماری مقدس ماں نے ہمیں ہمارے باپ کی خوشیوں کے لیے پالا ہے"۔

یہ اغلب ہے کہ تحلیل نفسی کا طریقہ خدا پر اعتقاد کے ذہنی پہلو پر ہی نہیں بلکہ غیر متوازن شخصیتوں پر مذہب کی کارفرمائیوں پر بھی خاصی روشنی ڈالے گا مگر اس ضمن میں سب سے زیادہ اس امر کی ضرورت ہے کہ مذہبی شخصیات پر تحلیل نفسی کے ایک ایسے سلسلے کا آغاز کیا جائے جس کا مقصد اس مسئلہ کا حل تلاش کرنا ہو۔ جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے تو میرے خیال میں اس سلسلے کی انتہا پسندانہ تحریروں سے کوئی سودمند نتائج نہیں پیدا ہو سکتے ہیں۔ جیسی تحلیل نفسی کے بین الاقوامی جرنل بابت مارچ ۱۹۲۱ء میں طبع ہوئی اور جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس میں مسیحی عقائد کی تحلیلِ نفسی کی گئی ہے مصنف نے اس عقیدہ کے اہم نکات لیے اور پھر فرائڈ کی عام اصطلاحات میں ان کا نفسیاتی تجزیہ کر دیا اور بس! لیکن اس امر کی کہیں وضاحت نہیں ہو پاتی کہ یہ تمام معانی ذاتی مشاہدہ کا نتیجہ ہیں۔ خدا کے "باپ" والے تصور کے لیے کہا گیا کہ یہ باپ کا متبادل ہے اور اسے وہ نوجوان اپناتے ہیں جن میں ایڈی پس الجھاؤ کے قوی رجحانات موجود ہیں ایسے لوگوں کے نزدیک ان کا حقیقی باپ ناکافی اور عدم تسکین دہ ہوتا ہے۔ خدا کو باپ کی علامت میں تسلیم کرنے کی حقیقی وجوہات وہ دبائے گئے پدری الجھاؤ ہوتے ہیں جن کی آسودگی کا سامان اس عقیدہ سے بہم پہنچتا ہے۔ خدا کے قادر مطلق ہونے کا تصور اس لاشعوری سعی کا مرہون منت ہے جس کی بنا پر انسان قبل از پیدائش کی اس آزادی کا خواہاں ہوتا ہے جو رحم مادر ہی میں میسر تھی۔ اسی طرح ہمیں بتایا جاتا ہے کہ "کنواری مریم" کی پرستش میں سب سے زیادہ دلکشی کا باعث بچہ کی وہ لاشعوری تمنا ہوتی ہے جس کے باعث بچہ خود کو باپ کی جگہ پر محسوس کرتا ہے یا پھر اسے باپ کی عدم موجودگی کا احساس ہوتا ہے لیکن ایسی خودساختہ سہل توجیہات علمی طریق کار کی منفی کرتی ہیں اسی لیے تو یہ امر اور بھی باعث تعجب ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ اس نظام کے حامیوں کا ایک ثانوی کارنامہ ہے۔ جن کا دعویٰ یہ ہے کہ نفسیات میں کٹر قسم کی ارادیت کا انطباق لازمی ہے۔ اگر یہ قرین قیاس معلوم ہو کہ تحلیلِ نفسی پر مبنی تحقیقات مذہبی تصورات کے آغاز اور ارتقا سے وابستہ بہت سے مسائل پر روشنی ڈالیں گی تو یہ اتنا قرینِ قیاس بھی نہیں کہ ایسی تحقیقات کے نتائج بلحاظ اہمیت اتنے ہی بنیادی بھی ثابت ہوں گے۔ حالانکہ اس نظریہ کے حامیوں کی اکثریت کا یہی خیال ہے اس کی بڑی وجہ یہ مفروضہ ہے جس کی بنا پر ماہرین تحلیل نفسی یہ باور کرتے ہیں کہ کسی دیئے گئے خیال کی بنا پر ظہور پذیر ہونے والے آزاد تلازمے کی آخری کڑی ہی کسی مخصوص تصور کی بنیاد اور باعث ہوتی ہے لیکن جیسا کہ ریواز کا کہنا ہے کہ بلا شواہد یہ مفروضہ تسلیم کرنا مشکل ہے۔

جیسا کہ فرائڈ کے حامیوں کا اس پر اصرار ہے البتہ یہ ہے کہ دیگر اہم انسانی کارکردگیوں کی مانند طفلانہ جنسیت کا بھی مذہب کی تشکیل میں کچھ کردار ہو لیکن یہ اتنی اہم بات نہیں کہ اس کی خاطر تشکیل مذہب کے دیگر تمام عوامل فراموش کر دیئے جائیں فرائڈ کے مقلدین — جن کے نزدیک جنس ہی زندگی کی تمام تر اور اہم توجیہ ہو سکتی ہے — ان کی حالت اس ماہر نباتات سے مشابہہ سمجھی جا سکتی ہے جو شاہ بلوط کی جڑ کھودنے پر بیج کے باقیات دریافت کر کے تمام شاہ بلوط کی اہمیت اسی میں مضمر دیکھے۔ لہذا وہ تمام سائنسدان جنہوں نے اس کے مطالعہ کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ وہ فن کار جو اس کے حسن سے لذت اندوز ہوتے اور وہ بڑھئی جو اس کی لکڑی استعمال کرتے ہیں وہ سب محض خوش فہمیوں کے جال میں پھنسے ہیں کیونکہ وہ سب اس امر سے ناآشنا ہیں کہ شاہ بلوط تو محض ایک انحطاط پذیر بیج ہے (ترجمہ)۔

— ० —